تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا

ماہنامہ

الفرقان

ربوہ پاکستان

مئی سنہ ۱۹۵۷ء

مقالات

۱۔ عقیدہ "قتل مرتد" کے خطرناک نتائج

۲۔ اہل ربوہ کی طرف سے اہل پیغام کے خطاب کا جواب

۳۔ مقام حدیث یعنی حدیث نبوی کی شرعی حیثیت

۴۔ موجودہ عیسائی عقائد اور حضرت مسیح ناصری کی تعلیمات

۵۔ فن صحافت کی رو سے خبر کی تعریف

ایڈیٹر

ابوالعطاء جالندھری

نائب ایڈیٹرز

مسعود احمد دہلوی۔ بی۔ اے

خورشید احمد شاد۔ مولوی فاضل

عقیدۂ "قتلِ مرتد" کے خطرناک نتائج

حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ اسلامی حکم لا اکراہ فی الدین کو قائم کرے!

"نوائے پاکستان" لاہور ۲۸ / اپریل ۵۷ء میں "بریلوی عقائد چھوڑنے پر سردار جندوڈا خان کو نماز میں شہید کر دیا گیا" اور "حملہ آور گرفتار مگر ترغیب قتل دینے والا ملا گرفتار نہیں کیا جا سکا" کے دوہرے عنوان سے ذیل کی خبر شائع ہوئی ہے:-

"بہاولپور ۲۶ / اپریل۔ بہاولپور سے چالیس میل دور احمد پور شرقیہ کے قریب ایک دیہات ترنڈہ محمد پناہ میں ایک نمبردار سردار جندوڈہ خاں کو مبینہ طور پر بریلوی فرقے کے لوگوں نے مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے قتل کر دیا۔ اس وحشیانہ قتل کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ترنڈہ محمد پناہ میں دیوبندی اور بریلوی ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور بسا اوقات نوبت ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ ترنڈہ محمد پناہ کے نمبردار سردار جندوڈا خاں پہلے بریلوی فرقہ کے حامی تھے! اور انکی وجہ سے گاؤں میں بریلوی فرقے کا کافی اثر تھا مگر کہا جاتا ہے کہ رمضان شریف سے قبل سردار جندوڈا خاں نے بریلوی فرقہ سے قطع تعلق کر لیا اس پر بریلوی مولویوں کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ کہیں دیوبندی مولوی انہیں اپنے قابو میں نہ کر لیں اور قصبے میں بریلویوں کا اقتدار اور اثر ختم نہ ہو جائے کہا جاتا ہے کہ قصبہ میں ایک باقاعدہ پروگرام کے تحت جامع مسجد میں بریلویوں کا ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں کافی لوگ شریک ہوئے جلسے میں ایک بریلوی مولوی [illegible] واضح طور پر یہ اعلان کیا کہ [illegible] کو چھوڑ دیا ہے چونکہ اسلام میں مرتد کا قتل جائز ہے اسلئے سردار جندوڈہ خاں کا قتل بھی اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ لوگ سردار جندوڈہ خاں کے خلاف مشتعل ہو گئے اور ایک دن جب وہ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ دو آدمی کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر مسجد میں آئے اور انہیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا مبینہ قاتل اگرچہ پکڑے گئے ہیں۔ مگر ترغیب دینے والا ملا ابھی تک روپوش ہے۔"

اس واقعہ سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کفر ملا کس طرح فضا میں زہر ملا رہے ہیں؟ اور اگر ان کافر گر ملاؤں کو احتساب کے شکنجے میں نہ جکڑا گیا تو ایک دن پورا بہاولپور شر و فساد کی لپیٹ میں آ جائیگا۔

ایڈیٹر "نوائے پاکستان" اپنے ادارتی نوٹ میں لکھتے ہیں:-

"جلسے میں ایک بریلوی مولوی نے تقریر کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ:-

سردار جندوڈا خاں مرتد ہو گیا ہے اور اسنے بریلوی عقیدہ کو چھوڑ دیا ہے۔ چونکہ اسلام میں مرتد کا قتل جائز ہے! اسلئے سردار جندوڈا خاں کا قتل بھی جائز اور اسلامی تقاضے کے عین مطابق ہے۔ اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ لوگ سردار جندوڈا خاں کے خلاف مشتعل ہو گئے اور ایک دن جبکہ وہ مسجد میں جماعت نماز ظہر ادا کر رہے تھے دو آدمی کلہاڑیوں سے [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد ۷ | مئی ۱۹۵۷ء | الفرقان ربوہ پاکستان | شوال ۱۳۷۶ھ | شمارہ ۵

اہلِ ربوہ کی طرف سے اہلِ پیغام کے خطاب کا جواب

غیر مبایعین کے پریذیڈنٹ صاحب کے "خطاب" کی حقیقت

سخت ناروا اندازِ خطاب

اخبار "پیغامِ صلح" ۲۷ مارچ میں ڈاکٹر غلام محمد صاحب کا ایک طویل مضمون "خطاب بہ اہل ربوہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مضمون بحیثیت مجموعی اس قابل نہیں۔ کہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب ہر دو غیر مبایعین کی طرف منسوب کیا جائے۔ یہ وہم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جس شخص نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مقدس چہرہ ایک نظر بھی دیکھا ہو جس کے کانوں نے آپ کے اخلاقی نصائح میں سے ایک کلمہ بھی سنا ہو وہ اس بے دردی، ظالمانہ انداز اور بازاری طرزِ خطاب کو حضرت مسیح پاک علیہ السلام کی اولاد اور آپ کے چمن کے نونہالوں کے حق میں اختیار کر سکتا ہے۔ جو ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے اختیار کیا ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے شکوہ کرنا بے اثر محسوس ہوتا ہے مگر میں درد بھرے دل سے ڈاکٹر صاحب پر واشگاف الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ اہل ربوہ اختلافِ رائے میں اظہارِ آزادی کے نظریہ کو کامل طور پر اپنانے کے باوجود اس طریقِ خطاب کو اپنے لئے ناقابلِ برداشت سمجھتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے ہمارے امام ہمام ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے متعلق اختیار کیا ہے۔ ہم میں ہزار خامیاں ہوں۔ ہمارے عقائد سے فریق لاہور کو کتنا اختلاف کیوں نہ ہو مگر وہ اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ کہ جماعت احمدیہ کو حضرت موعود علیہ السلام کے لختِ جگر سے والہانہ عقیدت ہے۔ اپنے مقدس خلیفہ اطال اللہ بقاءہٗ وایدہٗ تائیداً عظیماً سے انہیں غیر معمولی محبت ہے۔ میں کہتا ہوں آپ ہمیں غلط کار سمجھیں، ہمیں غلط عقائد والے کہیں مگر بھلا یہ بھی کوئی عقلمندی اور شریفانہ طریق ہے کہ "اہلِ ربوہ کو خطاب" کرتے ہوئے ان کے دلوں کو زخمی کرنے کے لئے ان کے جانوں سے عزیز امام ایدہ اللہ بنصرہ کو اس طرح گالیاں دی جائیں جس طرح ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے دی ہیں۔ ہمارے دلوں پر نمک پاشی سے قطع نظر آپ اپنے نقطۂ نظر سے ہی نظر ثانی فرمائیں کہ کیا اس دلآزار طریق خطاب سے اہلِ ربوہ آپ کے قریب آئیں گے؟ مجھے جناب مولوی آفتاب الدین صاحب مرحوم کے مکان واقعہ احمدیہ بلڈنگز میں ایک دفعہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب سے تعارف حاصل ہوا تھا۔ ان کے "صحابی" ہونیکے دعویٰ کے پیشِ نظر میرا خیال تھا کہ محترم مرتضیٰ خان صاحب کے بعد غالباً زندہ معروف غیر مبایعین میں ڈاکٹر صاحب آخری شخص ہونگے جو تحریر میں اس قسم کا ناواجب اور ظالمانہ طریق خطاب اختیار کریں گے مگر افسوس ع خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ اب ہم اس حصہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ہی ملتجی ہیں کہ وہ ہمارے پیارے امام کی انتہائی مظلومیت کو خود دیکھے اور ہمارے زخمی دلوں پر اپنی محبت کی مرہم رکھے اور اپنے رحم و کرم سے کم از کم ان غیر مبائع بھائیوں کو تو دانشمندانہ اور ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کی توفیق دے اور حق کی سمجھ بخشے جنہوں نے

حضرت مسیح پاک کو دیکھا اور ان کی محبت بھری باتوں کو سنا ہے۔ اللّٰھم آمین۔

ڈاکٹر صاحب سے ایک تحریر کا مطالبہ

ڈاکٹر غلام محمد صاحب "مکفر مولویوں کی ہمنوائی" کے زیر عنوان اہل ربوہ سے کہتے ہیں:۔

"جاؤ مکفر مولویوں کی آپ کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنیکی تحریروں کو ایک طرف اور مرزا محمود احمد صاحب کی تحریروں کو دوسری طرف رکھ کر دیکھ لو ان میں سر مو کوئی فرق نہ پاؤ گے۔"

ڈاکٹر صاحب! اہل ربوہ نے مکفر مولویوں کی جملہ تحریروں کو کھنگال کر دیکھا ہے۔ ان تحریروں اور حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی تحریروں دربارۂ نبوت حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں قطعاً کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی۔ بغرض اختصار میں ڈاکٹر صاحب سے مطالبہ کرتا ہوں۔ کہ وہ زیادہ نہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنے والی صرف ایک تحریر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ کی ایسی پیش کر دیں جو مکفر مولویوں کے ادعاء کے مطابق ہو! اور حضرت مسیح موعود کی اپنی تحریر سے سر مو بھی مختلف ہو۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو غیر تشریعی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع میں ملنے والی یعنی ظلی نبوت کا مدعی قرار دیا ہے! وہی بعینہٖ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات میں مذکور ہے اور یہی جماعت احمدیہ کا "متفقہ عقیدہ" رہا ہے۔ اور آج بھی ہمارا یہی اعتقاد ہے۔ ڈاکٹر غلام محمد صاحب میں اگر ذرہ بھی سچائی کا پاس ہے تو وہ مکفر مولویوں کی ایک تحریر ہی ایسی پیش کریں جو وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اسی طرح کی غیر تشریعی اور ظلی نبوت کا مدعی مانتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود کے متعلق مصری صاحب کی شہادت

باقی رہا یہ سوال کہ جماعت احمدیہ قادیان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کس قسم کا نبی مانتی تھی اور مانتی ہے۔ تو اسکے لئے میں غیر مبایعین کے موجودہ سب سے بڑے ظاہری عالم شیخ عبد الرحمن صاحب مصری کی شہادت پیش کرتا ہوں ان کی دستخطی تحریر ہمارے پاس موجود ہے اور یہ شہادت بارہا رسالہ فرقان میں چھپ چکی ہے۔ شیخ صاحب اسکا انکار نہیں کر سکتے۔ شیخ عبد الرحمن مصری لکھتے ہیں:۔

"میں حضرت صاحب یعنی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کا احمدی ہوں میں نے ۱۹۰۵ء میں بیعت کی تھی۔ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اسی طرح کا نبی یقین کرتا تھا اور کرتا ہوں۔ جس طرح خدا کے دیگر نبیوں اور رسولوں کو یقین کرتا ہوں بنفس نبوت میں نہ اس وقت فرق کرتا تھا اور نہ اب کرتا ہوں۔ لفظ استعارہ اور مجاز اس وقت میرے کانوں میں کبھی نہیں پڑے تھے بعد میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتب میں یہ الفاظ جن معنوں میں استعمال ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔ وہ میرے عقیدہ کے منافی نہیں ان معنوں میں میں اب بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علی سبیل المجاز ہی نبی سمجھتا ہوں یعنی شریعت جدیدہ کے بغیر نبی! اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی بدولت اور حضور کی اطاعت میں فنا ہو کر حضور کا کامل بروز ہو کر مقام نبوت کو حاصل کرنے والا نبی۔ میرے اس عقیدہ کی بنیاد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تقاریر و تحریرات اور جماعت احمدیہ کا متفقہ عقیدہ تھا۔

عبد الرحمن مصری ہیڈ ماسٹر مدرسہ احمدیہ

۲۴ اگست ۱۹۳۵ء"

اس شہادت سے جو غیر مبایعین کے نزدیک "ایک بہترین شہادت" ہوگی۔ صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ سے جماعت احمدیہ آپ کو متفقہ طور پر نبی مانتی آئی ہے ۱۹۱۴ء جماعت احمدیہ کے لئے نہایت مبارک سال تھا کہ جب کمزور اور جاہ طلب لوگوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی نبوت کے "متفقہ عقیدہ" سے انحراف کر کے جماعت کو دوسرے راستہ پر ڈالنا چاہا اللہ تعالیٰ نے حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ کے ذریعہ اس فتنہ کو دبا دیا۔ اور جماعت کو بحیثیت جماعت اسی "متفقہ عقیدہ" پر قائم رکھا۔ اگر ڈاکٹر غلام محمد صاحب کی قسم کے چند لوگ منحرف ہوئے ہوں تو یہ ان کی اپنی بدقسمتی ہے اپنی اندرونی نحوست سے بیچارے ۱۹۱۴ء کو خواہ مخواہ منحوس کہہ رہے ہیں۔ ما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔

مولوی محمد علی صاحب حضرت مسیح موعودؑ کو مدعی نبوت مانتے تھے۔

شاید ڈاکٹر غلام محمد صاحب شیخ مصری صاحب کی شہادت کو کافی نہ سمجھیں اس لئے ہم جناب مولوی محمد علی صاحب مرحوم کی صدہا شہادتوں میں سے ایک حلفیہ شہادت درج کرتے ہیں جو انہوں نے عدالت میں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی موجودگی میں بایں الفاظ ادا کی تھی۔ مولوی محمد علی صاحب کہتے ہیں:۔

"مرزا صاحب دعویٰ نبوت کا اپنی تصانیف میں کرتے ہیں۔ یہ دعویٰ نبوت اس قسم کا ہے کہ میں نبی ہوں لیکن کوئی نئی شریعت نہیں لایا۔"
(مسل مقدمہ مولوی کرم الدین ورق ۲۶۳)

اب ڈاکٹر صاحب بتائیں کہ کیا مکفر مولویوں سے ہرگز خوف نہ رکھنے والی یہ تحریر ہے نیز وہ بتائیں کہ کیا جماعت احمدیہ کا نبوت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق وہی عقیدہ نہ تھا جس سے ۱۹۱۴ء میں فریق لاہور نے انحراف اختیار کر لیا تھا؟

قادیان کی مرکزیت کی روشن دلیل اور الٰہی شہادت

ڈاکٹر غلام محمد صاحب اس امر پر بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ قادیان ہندوستان میں آگیا اور ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جماعت احمدیہ کے بیشتر حصہ اور خود حضرت امام جماعت ایدہ اللہ بنصرہ کو پاکستان آنا پڑا۔ لکھتے ہیں:۔

"اپنے حق پر اور ہمارے باطل پر ہونے کی ایک بڑی دلیل جو آپ نے پیش کی تھی۔ کہ مرکز قادیان کا آپ کے ہاتھ میں ہونا آپ کی سچائی پر دلیل ہے اس بودی دلیل پر بڑا زور دیا گیا۔ خدا کی شان ہے کہ مشیت ایزدی سے ایسے واقعات رونما ہوئے کہ قادیان کے جائے عافیت سے جہاں آپ جو چاہتے کرتے اور جو منہ میں آتا کہہ دیتے تھے اور کوئی آپ کو پوچھنے والا نہ تھا۔ آپ کو نکلنا پڑا۔"

ہمیں مسلم ہے۔ کہ قادیان کے مرکز کا جماعت احمدیہ کے ہاتھ میں ہونا غیر مبایعین کے خلاف ہماری صداقت کی دلیل ہے! اور بڑی دلیل ہے۔ اس دلیل کی بنیاد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ان پاک الفاظ پر ہے کہ:۔

"یہ ضروری ہوگا کہ مقام اس انجمن کا ہمیشہ قادیان رہے۔ کیونکہ خدا نے اس مقام کو برکت دی ہے۔" (الوصیت ص۲۵)

کیا اس دلیل کو "بودی دلیل" قرار دینا کسی خدا ترس احمدی کا کام ہو سکتا ہے۔ باقی رہی ہماری موجودہ ہجرت تو یہ خود اللہ تعالیٰ کی پیشگوئیوں کے مطابق ہے۔ جس پر الفضل میں حال ہی میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ ہماری اس ہجرت کے ساتھ ہماری صداقت کی یہ دلیل اور بھی نمایاں ہو گئی ہے

کیونکہ جس خدا نے ایسے سامان پیدا کئے ہیں کہ ہمیں قادیان سے نکلنا پڑا اسی خدائے علیم و حکیم نے ایسے سامان بھی پیدا فرمائے کہ قادیان کے خاص بابرکت حصہ یا حلقہ مسجد مبارک کو ہمیشہ کے لئے ہر حال میں جماعت احمدیہ کے قبضہ میں رکھا۔ اے گروہ غیر مبایعین! کیا آج تم میں ایک بھی ایسا انسان نہیں جو خدا کے اشارہ کو سمجھے اور جماعت احمدیہ کے ان سینکڑوں افراد کی بے مثال قربانی کی داد دے جو ہتھیلی پر جان رکھ کر اس مقدس مقام کی حفاظت کے لئے دیارِ حبیب میں دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ حتیٰ کہ حکومتِ ہند نے اعلان کیا کہ صدر انجمن احمدیہ قادیان یہیں باقاعدہ موجود رہا ہے اور سلسلہ کے کام اللہ تعالیٰ کے فضل سے قادیان سے بدستور ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر غلام محمد خوش ہیں کہ قادیان سے فرقت زدہ وہاں سے باچشم تر اور افسردہ نکلنے پر مجبور ہو گئے مگر انہیں جماعت احمدیہ کے وہ مقدس انسان نظر نہیں آتے جو مسیح پاکؑ کے ضریح (مزار) کی حفاظت کے لئے اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ غیر مبائع بھائیو! کبھی تو روحانی جذبات کی لذت سے بھی بہرہ اندوز ہونے کی کوشش کیا کرو۔ یہ معاندانہ روش آخر کب تک؟

تبدیلیٔ عقیدہ کے الزام کا تجزیہ

ہمارے "اعتقادات کی عمارت" کے متعلق ڈاکٹر غلام محمد صاحب کی خوش فہمی ملاحظہ ہو۔ ہمیں کہتے ہیں:-

"اپنے پہلے بیانات دربارہ نبوت کفر اور
تحقیقاتی عدالت میں دیئے ہوئے بیانات کو
بالمقابل رکھ کر دیکھ لیں کہ آیا آپ نے پہلے بیانات
سے رجوع نہیں کیا اور کیا آپ ان عقائد پر
نہیں آ رہے جن کے متعلق چالیس سال تک آپ
ہم سے برسرِ پیکار رہے؟"

اگر ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے یہ تحریر کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں لکھی تو ان میں بہت بڑا مغالطہ ہے۔ ہم نے نبوت وغیرہ کے متعلق اپنے پہلے اور پچھلے جملہ بیانات کو دیکھا ہے ان میں کسی قسم کا تضاد یا تبدیلی نہیں ہے۔ نبوت کے بارے میں تو ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک حرف تک پیش نہیں کیا اور نہ ہی خلافت کے عقیدہ کے بارے میں انہیں کسی تبدیلی کا وہم ہے گویا ہمارے اور غیر مبایعین کے اختلافی عقائد میں سے دو تہائی (یعنی نبوت مسیح موعود اور مسئلہ خلافت) کے متعلق انہیں کوئی اشکال نہیں۔ لے دیکر وہ تکفیر منکرین مسیح موعودؑ کے متعلق وہم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے تحقیقاتی عدالت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ کے بیان میں سے صرف ذیل کا ایک فقرہ نقل کیا ہے کہ:-

"کوئی شخص جو مرزا غلام احمد صاحب پر
ایمان نہیں لاتا وہ دائرۂ اسلام سے
خارج قرار نہیں دیا جا سکتا"

یہ فقرہ ہے جسے سیاق و سباق سے الگ کر کے مولوی فضل الرحمن صاحب سے لیکر ڈاکٹر غلام محمد صاحب تک تبدیلیٔ عقائد کی بنیادی دلیل قرار دے رہے ہیں حالانکہ خود بیان سے ظاہر ہے کہ اس جگہ دائرۂ اسلام سے مراد مسلمانوں کا عام شیرازہ یا اُمتِ محمدیہ کا وسیع دائرہ ہے۔ وہ دائرۂ اسلام مراد ہے جس کا فیصلہ انسانی حکومتیں کرتی ہیں اور جس پر سیاسی اور تمدنی حقوق کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔ وہ حقیقی دائرۂ اسلام مراد نہیں جس کی تعریف احکام الٰہی کی کامل اطاعت قرار دی گئی ہے۔ بیان میں اس کی وضاحت کے ساتھ حوالے بھی دیئے گئے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھی صرف لا تقربوا الصلوٰۃ پر عمل پیرا ہو رہے ہیں۔

دائرۂ اسلام کی دو اصطلاحیں اور غیر مبایعین

یاد رہے کہ ہمارے نزدیک ہمیشہ سے اور آج بھی مسیح موعودؑ کا کلمہ گو منکر حقیقی دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور اسی اور

بھی دائرہ اسلام کے اندر ہے۔ اس میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ یہ اُمت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ مسیح موعود کا منکرِ حقیقی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اِس مسئلہ یعنی دائرہ اسلام کی دو تعریفیں سب فرقوں کے نزدیک مسلّم ہیں۔ اور تو اور خود غیر مبایعین بھی اسے مانتے ہیں۔ ذرا ذیل کے حوالہ جات پر غور فرمائیں جنہیں غیر مبایعین تسلیم کرتے ہیں:۔

مولوی محمد علی صاحب غیر احمدیوں کے متعلق استفہام انکاری کے طور پر لکھتے ہیں:۔

"حضرت عیسٰےؑ کو دو ہزار سال سے زندہ بجسدہ العنصری آسمان پر بٹھا کر الآن کما کان کا مصداق بنا کر، اور خالق کی صفات میں شریک ٹھہرا کر، اور حضرت عیسٰےؑ ایک نبی اللہ کو ختم نبوت کے بعد لا کر اور ختم نبوت کے عملاً منکر، تبلیغِ اسلام کے فریضہ سے قطعاً لا پرواہ رہ کر انبیاء علیہم السلام کو طرح طرح کے گناہوں کے مرتکب ٹھہرا کر، قرآن کریم کی کئی سو آیات کو منسوخ سمجھتے ہوئے اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلنے کی تائید کرتے ہوئے اور کلمہ گوؤں کی تکفیر کرتے ہوئے بلکہ بعض ان میں سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مرتد اور منافق ٹھہراتے ہوئے یہ مسلمان۔ الیس منکم رجل رشید؟"

(رسالہ "ہمارے عقائد اور ہمارا کام" ص۱۸-۱۹)

"اِس اقتباس میں مولوی محمد علی صاحب نے غیر احمدیوں کے جو عقائد بیان کئے ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ:۔

(الف) یہ لوگ مسیح کو الآن کما کان اور خالق مانتے ہیں۔

(ب) یہ لوگ عملاً ختم نبوت کے منکر اور خاتم النبیین کے بعد نبی کے آنے کے قائل ہیں۔

(ج) یہ لوگ کلمہ گوؤں کی تکفیر کرتے ہیں۔

اب ذیل میں ہر سہ جرائم پر مسلّمہ فتوے ملاحظہ ہوں:۔

اوّل:۔ "یہ اعتقاد کہ پرندوں کے نوع میں سے کچھ تو خدا تعالیٰ کی مخلوق اور کچھ حضرت عیسیٰؑ کی مخلوق ہے سراسر فاسد اور مشرکانہ خیال ہے اور ایسا خیال رکھنے والا بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"

(ازالہ اوہام ص۱۲۵ طبع پنجم)

دوم:۔ "بیشک ختم نبوت کے منکر کو میں بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔"

(پیغام صلح ۲۷ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء)

سوم:۔ "جو مسلمان کو کافر کہتا ہے اور اسکو اہل قبلہ اور کلمہ گو اور عقائدِ اسلام کا معتقد پا کر پھر بھی کافر کہنے سے باز نہیں آتا وہ خود دائرہ اسلام سے خارج ہے۔" (آئینہ کمالاتِ اسلام ص۲۵۶)

ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال

اب ڈاکٹر غلام محمد ہی بتائیں کہ وہ غیر احمدی مسلمانوں کو دائرہ اسلام کے اندر سمجھتے ہیں یا انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں؟ پھر یہ بھی بتائیں کہ انکے نزدیک ایک ہی دائرہ اسلام ہے یا اسکی دو تعریفیں ہیں؟ جواب دیتے وقت ڈاکٹر صاحب اپنے گھر کے ذیل کے دو حوالوں پر بھی غور کرلیں۔

(الف) جناب مولوی محمد احسن صاحب امروہی نے لکھا ہے:۔

"پس جو لوگ ایسے مجدد دین اسلام (حضرت مسیح موعودؑ) کی نماز جنازہ پڑھنا درست نہ جانیں تو وہ گویا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔"

(رسالہ شمس بازغہ ص۹ مطبوعہ سنہ ۱۹۰۰ء)

(ب) پیغام صلح میں اعلان ہے کہ:۔

"ہم اِن مُردہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر کیا کرینگے جو اس زمانہ کے امام کا انکار کرتے ہیں، تکفیر کرتے ہیں اور جہالت کی موت مرنے کو تیار ہوتے ہیں۔"

(۴ راگست سنہ ۱۹۴۱ء)

دو قسم کے دائرہ ہائے اسلام اور احادیثِ نبویہ

اِن حوالہ جات کی موجودگی میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے مجدد

ساتھی یقیناً یہ تسلیم کرینگے کہ دراصل دائرۂ اسلام کی دو اصطلاحیں ہیں۔ ایک وہ دائرہ اسلام ہے۔ جو اسلامی حکومت اور ظاہری نظام کی طرف سے مقرر ہوگا۔ اسی کی طرف پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ من صلّیٰ صلاتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلك المسلم الذی له ذمة الله و ذمة رسوله (صحیح البخاری) کہ جو شخص ہماری طرح نماز پڑھتا ہے۔ اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرتا ہے۔ اور ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے۔ وہ وہی مسلمان ہے جس کی حفاظت کا خدا اور رسول کی طرف سے اعلان ہے۔

اس حدیث نبوی میں جس دائرۂ اسلام کی تعیین کی گئی ہے۔ اسی کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہٖ نے عدالت میں فرمایا۔ کہ حضرت مسیح موعودؑ کو نہ ماننے والا کلمہ گو اس دائرہ سے (کیونکہ یہی دائرۂ اسلام اس وقت زیر بحث تھا اور اسی کے متعلق کوئی عدالت یا کوئی حکومت بحث کر سکتی ہے) خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ تو ہے ظاہری اور نظامی دائرہ اسلام۔ اس کے علاوہ ایک حقیقی دائرۂ اسلام ہے جس سے صرف اللہ تعالیٰ ہی خارج قرار دے سکتا ہے۔ اور وہ کامل اطاعت کا دائرہ اسلام ہے۔ اس دائرہ میں داخلہ کی پانچ بنیادی شرائط ہیں یا بالفاظ دیگر پانچ ایمانیات ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان (۲) فرشتوں پر ایمان (۳) آسمانی کتابوں پر ایمان (۴) سب نبیوں پر ایمان (۵) قیامت پر ایمان ان پانچ امور میں سے کسی ایک کے متعلق بھی عدم ایمان انسان کو حقیقی دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ تمام اسلامی فرقوں کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبیوں میں سے کسی ایک نبی کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام (یعنی حقیقی دائرۂ اسلام) سے نکال دیتا ہے۔ ہاں یاد رہے کہ جب تک کسی منکر پر اتمام حجت نہ ہو وہ زیر مواخذہ نہیں آتا لیکن تاہم اس پر منکر کا لفظ ہی اطلاق پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لا یکلّف اللہ نفساً الّا وسعها۔

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہے۔ کہ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں حقیقی دائرۂ اسلام سے خارج ہو۔ اور اسی وقت میں وہ اسمی اور رسمی دائرہ اسلام میں داخل بھی ہو۔ اس لئے ایک اعتبار سے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگا۔ اور دوسرے اعتبار سے دائرۂ اسلام سے خارج ہوگا۔ فلاسفہ اسلام کہہ گئے ہیں۔ لولا الاعتبارات لبطلت الحکمة۔

امید ہے کہ اس صراحت پر غور کر کے ڈاکٹر غلام محمد صاحب اور ان کے ساتھی جماعت احمدیہ کے امام ہمام ایدہ اللہ بنصرہ پر تبدیلی عقیدہ یا تضاد کا ناروا الزام لگانے سے باز آجائیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے ترکش کا آخری تیر

ڈاکٹر غلام محمد صاحب اپنے ترکش کا آخری تیر چلاتے ہوئے موجودہ محرّضین کے رویہ پر خوشی کا اظہار کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"مندرجہ بالا وحادثات کے بعد خود ربوہ سے ایک طوفان اٹھا جس نے بقول گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے اس ڈھونگ کا راز طشت از بام کر دیا۔ اور اس پیراہن تقدس کا گریبان جس کے سایہ تلے اس تحریک نے نشو و نما پائی تھی۔ تار تار کر دیا"

ڈاکٹر صاحب منافقین کے گندے الزامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک اب میاں صاحب کیلئے مباہلہ کے بغیر کوئی مفر نہیں اور اگر وہ اس میں لیت و لعل کریں گے۔ تو اپنے متعلق شکوک میں اضافہ کریں گے ان کے لئے نادر موقعہ ہے۔ کہ مباہلہ کا چیلنج قبول کریں"

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب اہل ربوہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"ہم جماعت قادیان کے انصاف پسند اور فہیم طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ میاں صاحب سے مباہلہ قبول کرنے کا مطالبہ کریں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔"

(پیغام صلح ۲۷ مارچ ۱۹۵۷ء)

الزامات عقلاً بھی باطل ہیں

جماعت احمدیہ قادیان اور اہل ربوہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیوں کے مطابق یقین رکھتے ہیں۔ کہ سیدنا حضرت مصلح موعود ایدہ اللہ الودود ایک پاک اور مطہر وجود ہیں۔ انہیں الہام الٰہی میں یوسف قرار دیا گیا ہے۔ اور ہر قسم کے گندے الزاموں سے ان کی بریت کیلئے کلام الٰہی میں تصریحات موجود ہیں۔ پھر جماعت احمدیہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی زندگی بچپن سے لیکر آج تک مشاہدہ کی ہے۔ اور وہ آپکی پاکبازی اور پاکیزگی کے گواہ ہیں۔ پھر عقلی طور پر جو حالات دنیا کے سامنے ہیں۔ ان کی موجودگی میں جماعت احمدیہ ایسے گندے الزام لگانے والوں کو جھوٹے اور مفتری سمجھنے پر مجبور ہے۔ عقلی پہلو سے بھی یہ اتنی واضح بات ہے۔ کہ محترم چوہدری محمد اسماعیل صاحب ریٹائرڈ ڈی۔ اے۔ سی۔ جو غیر مبایعین کے ایک شریف رکن تھے۔ انہوں نے بھی لکھکر شائع کرایا :-

"میں حضرت میاں صاحب کی بہت بڑی عزت کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کے لئے بہت بڑی محبت اور احترام ہے۔ یہ الزامات جو ہیں تمام ظاہری حالات کے لحاظ سے یعنی انکے مسیح موعود کی اولاد ہونے کی وجہ سے اور ایسے مقام پر رہنے کی وجہ سے جہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام رہے۔ پھر چار بیویوں کا خاوند ہونے کی وجہ سے اور ایک بڑی جماعت کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے میرے نزدیک غلط ہیں۔" ص ۲۶

(رسالہ فرقان قادیان جولائی ۱۹۴۲ء)

علاوہ سابقہ پیشگوئیوں اور عقلی شواہد کے جماعت ربوہ تنتالیس ۴۳ سال سے خلافت ثانیہ کے دور میں بے شمار آسمانی برکات کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے محبوب بندے حضرت محمود ایدہ اللہ الودود کے ساتھ تائید و نصرت ربانی کے ان گنت واقعات جماعت ربوہ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کیا ڈاکٹر غلام محمد صاحب کا خیال ہے۔ کہ احمدی جماعت کے یہ لاکھوں ایثار پیشہ قربانی کرنیوالے انسان اندھے ہیں اور ڈاکٹر غلام محمد ایسا عداوت و دشمنی کا پتلا صاحب بصیرت ساء ما تحکمون۔

قرآنی قانون اور دعوت مباہلہ

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ آج ایک درجن کے قریب بے عمل، اور ناخدا ترس، علم دین سے بے بہرہ نوجوانوں کا حضرت محمود ایدہ اللہ بنصرہ العزیز پر اتہام لگانا جماعت احمدیہ کو برباد کر دے گا۔ اور خلافت کی محکم تنظیم میں رخنہ پیدا کر دیگا۔ مگر یہ اہل باطل کی پرانی خوش فہمی ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یتربصون بکم الدوائر کے پاک الفاظ میں فرمایا ہے۔ ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے ناصحانہ لبادہ اوڑھ کر ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہم ان چند بے عمل نوجوانوں کو قرآنی حکم کے مطابق کاذب اور جھوٹا کہنے کی بجائے ان کی دعوت مباہلہ قبول کرلیں۔

یاد رکھئے کہ جس شخص پر اتہام لگایا جائے۔ قرآنی شریعت اسے یہ حق دیتی ہے کہ وہ بہتان باندھنے والوں سے چار گواہوں کا مطالبہ کرے۔ اور قرآن مجید کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر الزام لگانے والے اس شرعی قانون کے مطابق چار گواہ

پیش نہ کر سکیں۔ فاولٰئک عند اللہ ھم الکاذبون تو وہ اسلامی شریعت کے مطابق جھوٹے قرار پائیں گے۔

قرآن مجید نے اتہام سننے والوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ فوراً اُسے بہتان عظیم قرار دیں۔ اور الزام لگانے والوں کو جھوٹا سمجھیں۔ بجز اس ایک صورت کے کہ وہ لوگ اپنے الزام کی تائید میں چار شرعی گواہ پیش کر سکیں۔ قرآن شریف نے کہیں بھی یہ ہدایت نہیں فرمائی۔ کہ ایک شخص بے گناہ انسانوں پر بہتان باندھنے کے بعد شرعی ثبوت دینے کی بجائے متہم کو دعوتِ مباہلہ دیا کرے۔ مسلمانوں کو اسلام نے ایسا بیوقوف بننے کی اجازت نہیں دی۔ کہ الزام لگانے والا خدائی قانون کو باطل کرنے کے لئے مباہلہ کا ڈھونگ رچائے۔ اور یہ لوگ اس کے فریب میں آجائیں۔

جماعت احمدیہ کے نزدیک کسی شخص پر الزام لگانے والا انسان بجائے شرعی ثبوت پیش کرنے کے اگر مباہلے کی دعوت دیتا ہے تو وہ درحقیقت شریعت کی ہتک کرتا ہے۔ اور خدائی قانون کو باطل کرنے کے لئے ایسی بات کی آڑ لیتا ہے جس کا اسے کوئی حق نہیں۔

غیر مبایعین کو حضرت امام جماعت احمدیہ کی طرف سے دعوت مباہلہ

ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مبایعین کے نزدیک الزام لگانے والے کا شرعی ثبوت پیش کرنے کی بجائے مباہلہ کی دعوت دے دینا از روئے قرآن مجید درست ہے۔

ہمارے نزدیک الزام لگانے والے کا دعوت مباہلہ دینا شرعی طور پر سراسر باطل ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہم اپنے عقیدہ کے مطابق گندے الزام لگا کر مباہلہ کی دعوت دینے کی آڑ لینے والوں سے مباہلہ نہیں کر سکتے اور ہم اسلامی شریعت اور قرآنی قانون کی توہین کرنے میں حصہ دار نہیں بن سکتے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ اور ہم نے سینکڑوں مرتبہ اس عقیدہ کا اعلان کیا ہے۔ اس عقیدہ کے خلاف ہمیں جھوٹے الزام لگانے والوں کی دعوت مباہلہ کو قبول کرنے کی ترغیب دینا اگر مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اس صراحت کے بعد میں غیر مبایعین پر اس اتمامِ حجت کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں جو ۱۹۲۹ء میں ہمارے امام ہمام ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مولوی محمد علی صاحب اور انکے ساتھیوں پر فرمائی تھی۔ واقعہ یوں ہوا کہ مستریوں نے گندے الزامات لگائے تو میں نے حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز سے ان الزامات کی تردید میں لکھنے کی اجازت طلب کی جس پر حضور نے خود اپنے قلم سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ذیل کی تحریر برائے اشاعت دی:۔

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کیساتھ

ھوالناصر

مکرمی السلام علیکم

بے شک اس کام کو شروع کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار اور ناصر ہو میں تو خود ان امور کا جواب دینا فرض تھا اور بعض رؤیا کی بناء پر جائز نہیں سمجھا۔ لیکن ایک اور دنی تدبر سے انسان ان لوگوں کے مفتریانہ بیانات کی حقیقت کو پا سکتا ہے۔ میرا جواب تو میرا رب ہے میں اسی کو اپنا گواہ بناتا ہوں۔ وہ سب کھلی اور پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ اور اُسی کا فیصلہ درست اور راست ہے۔ وہ اس امر پر گواہ ہے۔ کہ اخبار مباہلہ والوں نے سرتا پا جھوٹ بلکہ افتراء سے کام لیا ہے اور انشاء اللہ گواہ رہے گا۔ میں اسی کے فضل کا امیدوار اور اسکی نصرت کا طالب ہوں۔ ربّ انی مغلوبٌ فانتصر۔

میں ان لوگوں کے بیانات پر جو اخبار میں شائع ہوئے ہیں سوائے اس کے کیا کہوں کہ انہیں خدا تعالےٰ کی لعنت سے ڈرنا چاہیئے۔ کہ سرتاپا کذب و بہتان سے کام لے رہے ہیں اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگر میرا رب مجھ سے کام لینا چاہتا ہے تو وہ خود میرا محافظ ہوگا۔ اور اگر وہ مجھ سے کام نہیں لینا چاہتا تو لوگوں کی تعریفیں میرا کچھ نہیں بنا سکتیں۔ باقی رہیں ہدایات سو میرے نزدیک ہر ایک عقلمند انسان جو شریعت کے امور سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو ان لوگوں کے غلط طریق سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک سوال ہے جس کا شاید آپ جواب نہ دے سکیں اور وہ یہ ہے کہ بعض نادان اور شکوک و شبہات میں پڑے ہوئے لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ مباہلہ نہ کرنا اس سبب سے نہیں کہ میں مباہلہ کو جائز نہیں سمجھتا بلکہ اس سبب سے ہے کہ میں مباہلہ کرنا نہیں چاہتا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو مباہلہ بھی ہر شخص سے نہیں ہو سکتا اس کے لئے بھی شرائط ہیں۔ مگر اس قسم کے امور کے لئے کہ جن کے متعلق حدود مقرر ہیں اور گواہی کے خاص طریق مذکور ہیں مباہلہ چھوڑ کر قسم بھی جائز نہیں اور ہرگز درست نہیں کہ کسی شخص (الزام دہندہ) کو ایسے امور میں مباہلہ کے مطالبہ کی اجازت دی جائے یا مطالبہ پر مباہلہ کو منظور کر لیا جائے۔ مجھے یہ کامل یقین ہے اور ایک اور ایک دو کی طرح یقین ہے کہ ایسے امور کے متعلق مباہلہ کا مطالبہ کرنا یا ایسے مطالبہ کو منظور کرنا ہرگز درست نہیں بلکہ شریعت کی ہتک ہے۔ اور میں ہر مذہبی جماعت کے لیڈروں یا مقتدر اصحاب سے جو اس امر کا انکار کریں مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر مولوی محمد علی صاحب یا ان کے ساتھی جو "مباہلہ" کی اشاعت میں یا اس قسم کے اشتہارات کی اشاعت میں خاص حصہ لے رہے ہیں مجھ سے متفق نہیں بلکہ ایسے امور میں مباہلہ کے مطالبہ کو جائز سمجھتے ہیں اور ان کا یہ یقین ہے کہ جو شخص ایسے مطالبہ کو منظور نہیں کرتا وہ گویا اپنے جرم کا ثبوت دیتا ہے۔ تو ان کو چاہیئے کہ اس امر پر مجھ سے مباہلہ کر لیں۔ پھر اللہ تعالیٰ حق و باطل میں خود فیصلہ کر دے گا۔

خاکسار

مرزا محمود احمد

۲۹/۶/۱۵

(مندرجہ رسالہ جواب مباہلہ ملا نیز الفضل ۲ رمئی ۱۹۳۰ء)

اس صاف اور واضح بیان کے بعد غیر مبائعین لما ربع صدی سے زیادہ عرصہ تک اس دعوت کو قبول نہ

کرنا بتلاتا ہے کہ دل میں وہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ الزام لگانے والے کو ازروئے شریعت مباہلے کی دعوت دینے کا حق نہیں ہے۔ اگر آج ڈاکٹر غلام محمد صاحب یا ان کے ساتھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے الزام لگانے والے کو مباہلے کی دعوت دینے کا حق ہے تو وہ آئیں حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی ۱۹۲۹ء کی دعوت آج بھی قائم ہے اور جماعت احمدیہ اس قرآنی مسئلے کی سچائی اور اپنے عقیدہ کی صحت پر غیر مبایعین سے مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جس طرح مولوی محمد علی صاحب مرحوم اور آج تک اُن کی ساری جماعت اِس دعوتِ مباہلہ کو قبول نہیں کر سکی اسی طرح ڈاکٹر غلام محمد صاحب اور ان کے ساتھی بھی کبھی اِس میدان میں نہیں آئیں گے۔

بہتان باندھنے والوں کا بُرا انجام

سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی مذکورہ بالا فیصلہ کن تحریر ایک ایماندار انسان کے لئے بہت بڑا نشان ہے۔ سب غیر مبایعین جانتے ہیں کہ اخبار "مباہلہ" والے مستری صاحبان جنہوں نے یہ الزامات لگانے میں پہل کی تھی حضور کے اِس اعلان کے بعد اُن کا کیا انجام ہوا تھا؟ خود اخبار پیغام صلح نے لکھا تھا۔

"مباہلہ والے مستری احمدیت کو چھوڑ کر احمدیت کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے ہیں" (اخبار پیغام صلح ۱۲ راگست ۱۹۴۲ء)

پھر روزنامہ احسان لاہور اعلان کرتا ہے۔

"آل انڈیا مجلس احرار ہند کی ورکنگ کمیٹی نے مولوی عبدالکریم مباہلہ سابق جنرل سیکرٹری مجلس احرار ہند شعبہ تبلیغ کو ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کی بنا پر جو انہوں نے مجلس کے قادیان مشن کے خلاف اختیار کر رکھی ہیں پانچ سال کے لئے تمام عہدوں اور ابتدائی ممبری سے خارج کر دیا ہے" (اخبار احسان لاہور ۲۲ راگست ۱۹۴۲ء)

گویا یہ الزام لگانے والے دینی اور دُنیوی طور پر عذاب الٰہی کے مورد بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے۔ ومن یلعن اللہ فلن تجد لہٗ نصیراً۔

مستریوں کے بعد شیخ عبدالرحمٰن صاحب مصری نے انہی کے نام سے ان الزامات کو دُہرایا۔ اور اپنے علم کے گھمنڈ پر اشاعتِ فاحشہ کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن وہ بھی ان عقائد سے برگشتہ ہو گئے جنہیں خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے لائے ہوئے صحیح عقائد مانتے تھے۔ شیخ مصری صاحب نے جماعت احمدیہ سے علیحدگی کے بعد اپنے اشتہار "جماعت کو خطاب" میں حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کو مخاطب کرتے ہوئے شائع کیا تھا۔

"دُنیا میں کوئی ایسی جماعت نہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوئے صحیح عقائد و تعلیم پر قائم ہو بجز اس جماعت کے جس نے آپ کو خلیفہ تسلیم کیا ہوا

ہے" (اشتہار "جماعت کو خطاب"
صد ۲ مطبوعہ ۱۹۲۷ء)

مگر دنیا جانتی ہے کہ شیخ مصری صاحب کو اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے لائے ہوئے صحیح عقائد سے کیا نسبت ہے۔ اگر کوئی خدا ترس دل رکھتا ہے تو ذرا سوچے کہ یہ کیا بات ہے۔ کہ یہ لوگ الزام لگا کر حقیقی اسلام یعنی احمدیت سے انحراف کی راہ کیوں اختیار کر لیتے ہیں۔ کیا یہ ان کے الزامات کے جھوٹا ہونے کی خود واضح دلیل نہیں ہے؟

ابھی ڈاکٹر صاحب موجودہ منافقین کو "گھر کا بھیدی" کہہ کر خوش ہو رہے ہیں۔ مگر ان کے عقائد، ان کے اعمال اور ان کے گفتار و کردار پر نگاہ کر کے ذرا بتائیں کہ کیا یہی اسلامی اخلاق اور اسلامی عقائد ہیں؟ صحیح عقائد سے برگشتہ ہو جانا خود ایک سزا ہے۔ اعمال صالحہ سے محروم رہ جانا خود ایک لعنت ہے۔ اور اگر کوئی شخص سوچنے والا دل رکھتا ہے تو اس کے لئے اس میں بہت بڑا نشان ہے۔

حضرت امام جماعت احمدیہ کی پاکبازی پر جناب مولوی محمد علی صاحب کی شہادت!

ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے جماعت کے انصاف پسند اور فہیم طبقہ سے درخواست کی ہے۔ سو جماعت احمدیہ کے خدا ترس اور تقویٰ شعار انسانوں کا قولی اور عملی جواب یہ ہے۔ کہ جس دعوت مباہلہ کو قبول کرنا ہم شرعاً ناجائز سمجھتے ہیں اس کی قبولیت کا ہم مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں۔ اور جو دعوت مباہلہ جائز اور روا ہے اس کے لئے سطور بالا میں چیلنج ذکر کر دیا گیا ہے۔ باقی رہا "دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جانا" سو جماعت کو تو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں اور جماعت کو چند بے عمل انسانوں کی جھوٹی باتوں سے شبہ پیدا بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تو خیر خلافت ثانیہ کے دامن سے وابستہ انسان ہیں خود غیر مبایعین ابتدائے سلسلہ سے حضرت محمود ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی پاکیزہ زندگی پر گواہی دیتے آئے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جناب مولوی محمد علی صاحب نے حضرت محمود ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے وجود کو صداقت احمدیت پر ایک دلیل قرار دیا تھا۔ چنانچہ جناب مولوی صاحب رسالہ تشحیذ الاذہان پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس رسالہ (تشحیذ الاذہان) کے اڈیٹر مرزا بشیر الدین محمود احمد حضرت اقدس کے صاحبزادہ ہیں اور پہلے نمبر میں چودہ صفحوں کا ایک انٹروڈکشن ان کی قلم سے لکھا ہوا ہے۔ جماعت تو اس مضمون کو پڑھے گی مگر میں اس مضمون کو مخالفین سلسلہ کے سامنے بطور ایک بین دلیل کے پیش کرتا ہوں جو اس سلسلہ کی صداقت پر گواہ ہے ....

.... میں نے اس مضمون کو اس سلسلہ کی صداقت پر گواہ خصوصاً اس وجہ سے نہیں ٹھہرایا کہ ان دلائل کو کوئی مخالف توڑ نہیں سکتا۔ یہ دلائل پہلے بھی کئی دفعہ پیش ہو چکے ہیں۔ مگر اس دلیل میں سے جو دلیل میں سلسلہ کی صداقت پر گواہ کے طور پر اس وقت

ٹھہراتے ہیں تو کیا یہ ان کے خود اندر کے گند کی کھلی شہادت نہیں؟

حضرت امام جماعت احمدیہ کی پاکبازی پر اکابر غیر مبایعین کی ۱۹۱۴ء کی شہادتیں!

آخر میں ہم دونوں جماعتوں کے باہمی اختلاف کے بعد کی اس واضح شہادت کو درج کرتے ہیں۔ جو ایڈیٹر صاحب پیغام صلح نے آخر مارچ ۱۹۱۴ء میں اپنے مقالہ افتتاحیہ میں شائع کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:-

(الف) "اس میں کس ایماندار کو کلام ہے کہ حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب اور حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب خدا کے مامور اور برگزیدہ کے فرزند۔ صاحب علم۔ صاحب عفت۔ صالح اور نیک اطوار اور ائمۃ الہدیٰ ہونے کے ہر طرح قابل ہیں۔ اور یہ سب فرزند بلاشبہ روحانی اور جسمانی دونوں معنوں کی رو سے حضرت مسیح موعودؑ کی آل ہیں۔ اور انّ اللہ معک و مع اھلک کے الہام کے پورے مصداق ہیں۔"

(ب) "پیارے ناظرین! ہم آپ کو یقین کلی دلاتے ہیں۔ کہ ہم حضرت صاحبزادہ صاحب (سیدنا حضرت محمود ایدہ اللہ الودود) کو اپنا ایک بزرگ اور امیر اور ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں۔ اور ان کی پاکیزگی روح اور بلندی فطرت اور علو استعداد اور روشن جوہری اور سعادت جبلی کو مانتے ہیں اور دل سے ان سے محبت کرتے ہیں واللہ علی ما نقول شھید مگر اعتقاد میں فرق ہونے کی وجہ ہم ان سے بیعت نہیں کر سکتے"!

(پیغام صلح ۲۹ مارچ ۱۹۱۴ء)

اب میں درد بھرے دل سے غیر مبایعین سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ قیامت کی باز پرس کا خیال کر کے اس انتہائی ظالمانہ انداز مخالفت سے اجتناب اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مظلوم و مطہر بندوں کے لئے بہت غیور ہے۔ آپ لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نام میں ہمارے ساتھ شریک ہیں اگر کوئی مسئلہ سمجھ نہ آئے۔ یا سنجیدگی سے کوئی اختلاف ہو تو وہ اور بات ہے مگر کیا آپ کے دل مان سکتے ہیں کہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے جو طریق گفتگو اہل ربوہ سے خطاب میں اختیار کیا ہے۔ یہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے؟ ہم تو معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

ڈاکٹر صاحب کے تتمہ پر نظر

سطور بالا لکھی جا چکی تھیں کہ یکم مئی ۵۷ء کا پیغام صلح آ گیا اس میں ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے مضمون کو دوبارہ بطور ضمیمہ شائع کیا گیا ہے۔ مضمون کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے ایک تتمہ بڑھا دیا ہے۔ اس میں پھر اپنی باتوں کو دوہرا کر لکھتے ہیں:-

"اب یہ ہر سہ امور خود میاں صاحب سے تعلق رکھتے ہیں اور وہی ان کا جواب دے سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا ان کی جگہ سینہ سپر نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی میاں صاحب کی پوزیشن بسبب انکے دعاوی کے ایک پبلک مین کی ہے۔ اور ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ ان کے افعال پر تنقید کرے۔ اور

ان کو پرکھے۔ اور ان کا فرض ہے کہ وہ
اپنی پوزیشن صاف کریں۔"

ہمارے نزدیک ڈاکٹر صاحب نے یہ گریز کی راہ اختیار کی ہے۔ جب انہوں نے اہل ربوہ سے خطاب کیا ہے تو اہل ربوہ میں سے ہر ایک کو اس خطاب کا جواب دینے کا حق ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو نفسِ جواب پر غور کرنا چاہیئے اگر حضرت امام جماعت احمدیہ کے "پبلک مین" ہونے کے باعث ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ کہ ان پر تنقید کرے۔ تو اسی اصول کی بنا پر کی گئی غلط تنقید کی تردید کرنے کا بھی ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ یہ کتنی غیر معقول بات ہے۔ کہ تنقید تو ہر شخص کر سکے مگر تردیدِ تنقید صرف ایک شخص ہی کر سکتا ہے۔

ہمارے جوابات میں ڈاکٹر صاحب کے ہر الزام کا جواب خود حضرت امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ بنصرہٖ کے قلم سے درج ہے اب ڈاکٹر صاحب کیا عذر تراشیں گے

ڈاکٹر غلام محمد صاحب تتمہ کے آخر میں لکھتے ہیں:-

"بالآخر اہلِ ربوہ سے درخواست ہے۔ کہ
وہ احمدیت کی روایات کو قائم رکھیں اور
رکیک تاویلات اور تلبیس و دشنام طرازی
سے پرہیز کریں۔ خود وہ ہتھکنڈے نہ برتیں جو
مخالفینِ سلسلہ نے سلسلہ حقہ کے خلاف استعمال
کئے ہیں۔ حق و باطل میں فیصلہ کرنے کے لئے
تمسک بالقرآن اور منہاج نبوت کو سامنے
رکھنا چاہیئے۔"

اہل ربوہ حیران ہیں۔ کہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے قلم سے یہ باتیں کس طرح مناسب ہیں۔ جن کا مضمون سراسر "تلبیس و دشنام طرازی" کا مرقع ہے۔ جنہوں نے مخالفین سلسلہ کے قدم بقدم رکھا ہے۔ اور اپنے سارے مضمون میں "تمسک بالقرآن اور منہاج نبوت" کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی شاید ڈاکٹر صاحب کو آیتِ قرآنی لِمَ تقولون ما لا تفعلون یاد نہیں۔ بایں ہمہ ہم غیر مبایعین کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے احمدیت کی روایات کو قائم رکھا ہے۔ اور ہمیشہ رکھیں گے ہم حق و باطل کا فیصلہ قرآن مجید اور منہاج نبوت سے کرتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان بچھڑے بھائیوں کو بھی راہ حق کے قبول کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

آخری گزارش غیر مبایع بھائیو! آپ لوگ سلسلہ احمدیہ کے افراد ہیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی ذمہ واری ہے۔ اس زمانہ میں اسلام کو اس کی اصلی صورت میں پیش کرنا جماعت احمدیہ کا کام ہے۔ اس کے صحیح عقائد اور اخلاق کا نمونہ دکھلانا جماعت کی ذمہ واری ہے۔ آپ بھی جماعت احمدیہ کی طرف منسوب ہیں۔ آپ کو جماعت احمدیہ قادیان سے چند امور میں اختلاف ہے۔ آپ چاہیں تو اس اختلاف کو اتنا بڑھا دیں کہ پھر آپ کے ہم سے ملنے کی راہ باقی نہ رہے اور اگر آپ چاہیں تو ان امور کو بآسانی طے کیا جا سکتا ہے۔ میں آپ سے یہ گزارش نہیں کر رہا کہ آپ اختلاف کو یونہی چھوڑ دیں۔ میری صرف اتنی درخواست ہے کہ اس اختلاف کو اس کی محدود حدود کے اندر رکھا جائے اور اس کو نپٹانے کے لئے دلیل و برہان سے کام لیا جائے۔ میری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ مسائل کے اختلاف کو ذاتیات یا گالی گلوچ کا ذریعہ نہ بنائیں۔ ہم خود دنیا میں دو مختلف خیال کے لوگ جادلھم بالتی ھی احسن کا نمونہ قائم کرنے والے بھی ہونے چاہئیں۔ میں اسی گزارش پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ واٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین۔

خاکسار
ابوالعطاء جالندھری

۵/۴/۱۹۵۷ء ۔ ۳ شوال ۱۳۷۶ھ

پیشگوئی مصلح موعود پر فیصلہ کن تحریری بحث کی دعوت

"پیغام صلح" کے عذراتِ گریز پر نظر

ہم نے الفضل (۱۶ راپریل) میں فریق لاہور کے اصحاب کو دعوت دی تھی کہ روزمرہ کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لئے مصلح موعود کی پیشگوئی کے مصداق کے بارے میں ایک فیصلہ کن تحریری مباحثہ ہو جائے۔ جس میں فریقین کے دلائل مجموعی طور پر سب احباب کے سامنے آجائیں۔ اور جہاں تک عام تحقیق کا سوال ہے یہ معاملہ پوری طرح نکھر جائے اور حق و باطل میں فیصلہ ہو جائے۔

فریق لاہور کے اصحاب بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو صادق اور آپ کی بیان فرمودہ پیشگوئی دربارہ مصلح موعود کو برحق مانتے ہیں۔ اس حد تک انہیں جماعت احمدیہ سے کوئی اختلاف نہیں۔ پھر یہ بھی سب کو مسلّم ہے کہ جو بھی پیشگوئی کے مطابق مصلح موعود قرار پائیگا وہ اپنے وقت میں صداقت کی کسوٹی ہوگا۔ اس کے عقائد صحیح عقائد ہونگے اس کے اعمال صالح اور پاکیزہ ہوں گے۔ اس سے اختلاف کرنے والے بہرحال غلطی پر ہوں گے۔ الہامی الفاظ میں یہ تصریح موجود ہے اور جماعت احمدیہ اور فریق لاہور ہر دو کو مسلّم ہے۔

اب ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اندریں صورت باہمی اختلافی مسائل اور روزروز کی آویزش کو ختم کرنیکا بہترین راستہ یہی ہے کہ دونوں جماعتیں مصلح موعود کی تعیین کے بارے میں قطعی فیصلہ کرلیں۔ جماعت احمدیہ کا پختہ ایمان ہے کہ الہامی الفاظ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصریحات اور واقعات کے مطابق حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب ایدہ اللہ بنصرہ ہی مصلح موعود ہیں۔ غیر مبایعین کا خیال ہے کہ آپ مصلح موعود نہیں بلکہ مصلح موعود آئندہ کسی زمانہ میں پیدا ہوگا۔

ہم نے الفضل ۱۶ راپریل میں فریق لاہور کو دعوت دی تھی کہ آیئے ہم دونوں فریق تحریری بحث کے ذریعہ مصلح موعود کی تعیین کرلیں۔ پھر دونوں فریق کے دلائل مجموعی طور پر شائع ہو جائیں، جس سے عوام کو بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔

جناب مدیر صاحب پیغام صلح نے اپنے اخبار مؤرخہ ۲۴ راپریل میں "تصفیہ کی آسان راہ" کے زیرعنوان ہماری دعوت کو منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ انکار جن خام عذرات کی بناء پر کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔ مدیر صاحب لکھتے ہیں :-

"ہمیں اس دعوت کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا اگر میاں محمود احمد صاحب کا دعویٰ مصلحیت کسی حقیقت پر مبنی ہوتا اور ان کے عقائد و اعمال اس بات کی اجازت دیتے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔"

جواباً عرض ہے کہ فنِ مناظرہ میں اس عذر کو مصادرہ علی المطلوب کہتے ہیں۔ یہی سوال تو مباحثہ میں طے ہونا ہے کہ حضرت میرزا محمود احمد صاحب ایدہ اللہ کا دعویٰ "مصلحیت" حقیقت پر مبنی ہے یا نہیں؟ اور آپ کے عقائد و اعمال اس دعویٰ کے منافی تو نہیں؟ ہر صاحب فہم سمجھ سکتا ہے کہ مدیر پیغام صلح کا یہ عذر کس قدر بے بنیاد اور خام ہے۔ جناب عالی! جب دعویٰ مصلحیت موجود اور جماعت احمدیہ کے لاکھوں افراد اس پر ایمان رکھتے ہیں تو اس پر سنجیدہ بحث نہ کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ آپ جو آئے دن پیغام صلح کے صفحات کے صفحات سیاہ کر رہے ہیں کیا یہ سب غیر سنجیدہ حرکات ہی ہیں۔ آپ صاحبان کو

دعویٰ مصلحیت پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ جناب ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

" مولوی ابو العطاء صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ نے برملا علیٰ اعلان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے الہام میں بتا دیا ہے کہ میں ہی اس پیشگوئی کا مصداق ہوں" حالانکہ میاں صاحب کا دعویٰ کسی صریح الہام کی بناء پر نہیں بلکہ ایک خواب پر مبنی ہے جس کی کئی تعبیریں ہو سکتی ہیں "

جناب ایڈیٹر صاحب کا یہ عذر بھی سراسر کمزور ہے۔ یہ بات کہ دعویٰ کی بنیاد "صریح الہام" پر نہیں محض خواب پر ہے خود بحث طلب ہوگی مگر میں اس موضوع کو یہاں شروع نہیں کرنا چاہتا کہ حضور ایدہ اللہ بنصرہ کا دعویٰ مصلحیت "صریح الہام" پر مبنی ہے یا خواب پر۔ اس سے اصل دعوت کو التوا میں ڈال دیا جائیگا اسلئے میں عرض کرتا ہوں کہ اس کا فیصلہ بھی تحریری مناظرہ میں ہو جائیگا کہ حضرت امام جماعت احمدیہ کے مصلح موعود ہونیکے دعویٰ کی بناء الہام ہے یا محض خواب۔

جناب مدیر پیغام صلح تحریر کرتے ہیں :۔

" دوسری بات جو ہمیں اس دعوت کو قبول کرنے سے مانع ہے وہ خلیفہ صاحب کے اعتقادات اور انکے اعمال ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کے اعتقادات بانیٔ سلسلہ حضرت مسیح موعودؑ کے اعتقادات کے خلاف رہے ہیں اور یہ انکے دعویٰ مصلحیت کی صداقت کے منافی ہے "

مجھے حیرت ہے کہ مولوی دوست محمد صاحب مدیر پیغام صلح نے یہ کیا بات لکھدی ہے محض اپنے دعویٰ کو بطور دلیل پیش کر دینا تو کوئی کمال نہیں ہے۔ دلیل تو وہ ہوتی ہے جو عقلاً یا اعتقاداً مسلّم فریق مخاطب ہو۔ یہاں آپ محض اپنے بے بنیاد دعویٰ کو بطور دلیل پیش کر رہے ہیں۔ ایں چہ بوالعجبی است۔

اگر غیر احمدی اسی طرح کہیں کہ ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعویٰ پر غور کرنے یا بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ انکے عقائد اور انکے اعمال ہمارے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن مجید کے خلاف ہیں اور یہ انکے دعویٰ مسیح موعود کی صداقت کے منافی ہے بتایئے غیر مبائع دوست انکو کیا جواب دینگے؟ وہی جواب ہمارا سمجھا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ تحریری مناظرہ مصلح موعود کے موضوع پر ہونے دیں وہاں آپ اپنا یہ دعویٰ بھی پیش کر دیں اس کی قلعی بھی وہاں کھل جائیگی انشاء اللہ۔

آخری بات جناب ایڈیٹر صاحب نے یوں لکھی ہے :۔

"تیسری بات جو نہایت اہم ہے وہ خلیفہ صاحب کے اعمال کے متعلق انکے مریدوں کے ایسے بیانات ہیں جنکی تردید جبتک شرعی نقطۂ نگاہ سے نہ کی جائے انکی پوزیشن ایک غیر جانبدار انسان کے نزدیک مخدوش ہو جاتی ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ وہ بیانات اور الزامات صحیح ہیں یا غلط لیکن انکی صفائی ضروری ہے اور اسکا طریق جیسا کہ محترم ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے لکھا ہے یہی ہو سکتا ہے کہ وہ الزام دہندگان کی دعوت مباہلہ کو منظور کرلیں"

کیا کوئی خدا ترس انسان دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ ایڈیٹر پیغام کا یہ عذر کسی قسم کی دیانتداری پر مبنی ہے۔ اگر کسی برگزیدہ انسان پر چند ناپاک طبع اور منافقین کے الزام لگا دینے کے بعد اسکی صداقت کو زیرِ غور نہ لانا درست شیوہ ہے تو پھر اہل پیغام کو بہت سے انبیاء اور صلحاء کی سچائی کا بھی انکار کرنا پڑیگا۔ مجھے ضرورت نہیں کہ ان بزرگوں اور مقدس انسانوں کے نام لوں غیر مبائعین خود جانتے ہیں۔

باقی رہی الزامات کی تردید "شرعی نقطۂ نگاہ سے" تو قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اگر الزام لگانیوالے چار گواہوں کا شرعی ثبوت پیش نہ کریں تو فاولٰئک عند اللہ ھم الکاذبون وہ شرعاً جھوٹے اور کاذب ہیں۔ اگر شریعت سے مراد قرآن مجید ہے تو اسکا تو یہی حکم ہے اور اگر غیر مبائعین کی شریعت سے مراد ڈاکٹر غلام محمد صاحب ہیں تو ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں۔

قارئین کرام! ان عذرات واہیہ کی تردید کے ساتھ ہم پھر اعلان کرتے ہیں کہ اگر غیر مبائعین میں انصاف پرستی کا مادہ ہے تو وہ گندے الزامات کی آڑ لینے کی بجائے مصلح موعود کے تعین کے بارے میں تحریری بحث کی دعوت کو منظور کریں۔ کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں؟ دیدہ باید۔ (خاکسار ابو العطاء جالندھری)

منکرین حدیث نبویؐ کے اعتراضات کے جواب

مقامِ حدیث

یعنی

حدیث نبویؐ کی شرعی حیثیت!

(از جناب مولوی خورشید احمد صاحب شاد پروفیسر جامعۃ المبشرین)

ذیل کا علمی مقالہ جناب شاد صاحب نے جامعۃ المبشرین کی مجلس مذاکرہ علمیہ میں پڑھا تھا۔ اسے افادۂ عام کے لئے شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں منکرین حدیث نبویؐ کے حدیث پر اعتراضات کے جواب بھی دیئے گئے ہیں۔ مقالہ نہایت محنت سے تیار کیا گیا ہے ــــــــــ (ایڈیٹر)

"مقام حدیث" کے عنوان کے ماتحت عموماً یہی بحث کی جاتی ہے کہ شرع اسلام میں حدیث کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے متعلق سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ پہلے علماء نے حدیث کی شرعی حیثیت کے متعلق کیا کچھ کہا ہے سو اس کے متعلق دو بڑے گروہ ہیں، ایک اہل حدیث دوسرے اہل قرآن۔ ان دونوں گروہوں نے حدیث کے متعلق افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے اہلحدیث نے حدیث کو اس قدر بلند مقام دیدیا کہ اسے کتاب اللہ پر قاضی قرار دیدیا۔ اور اہل قرآن نے ان کی ضد میں یا بعض ایسی احادیث سے گھبرا کر جو خلاف قرآن، خلاف سُنّت یا خلافِ عقل تھیں حدیث کو سرے سے ہی جواب دیدیا۔

سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتاب ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی میں ان دونوں گروہوں کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ حدیث کے متعلق رقم فرمایا ہے اُسے مَیں ملخصاً اپنے الفاظ میں درج ذیل کرتا ہوں۔ حضور فرماتے ہیں۔

حدیث کے متعلق دو گروہوں نے افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے۔ مولوی عبداللہ چکڑالو[ی]
ان کے گروہ نے تفریط اختیار کی ہے کہ وہ ح[دیث]
سرے سے انکار کر کے قُل ان کنتم تحبّو[ن اللہ]
فاتبعونی یُحببکم اللہ کی خلاف ورزی [کرتے]
ہیں اور حدیث کو چھوڑ کر اتباعِ نبوی کو بھی چھو[ڑتے]
ہیں۔ اگر محمد حسین صاحب بٹالوی کا مسلک اختی[ار کیا جائے]
تو ان سے قرآن بھی ہاتھ سے جاتا ہے اور حدی[ث]
قرآن اس طرح کہ ان کے نزدیک اس کا حکم بغیر [...]
حدیث کے فیصلہ کے کچھ بھی نہیں۔ اور حدیث [...]
کہ ان کی جمع و تدوین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ [وسلم کی]
نگرانی حاصل نہیں اسلئے انسانی دست برد کا [...]
ضرور دخل ہے۔ پھر وہ آحاد کا ذخیرہ اور ظنی ہ[...]
متواتر بالکل شاذ ہیں اور ظنیات کو مستقلاً بنیا[د]
بنانا درست نہیں۔

مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کے مسلک [...]
مان کر ہمیں ان بے شمار صداقتوں سے محروم ہو[نا پڑتا]
ہے جو کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ اس فساد ک[ی]
وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے حدیث سے مراد آنحضر[ت ...]

صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل دونوں لے لئے ہیں۔ لہذا ان دونوں مسالک کے درمیان صراط مستقیم یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہدایت پر قائم رہنے کے لئے تین چیزیں عطا فرمائی ہیں۔

اوّل۔ قرآن مجید جو اللہ تعالیٰ کا قطعی اور یقینی کلام ہے۔

دوم۔ سُنّت۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی روش جو اپنے اندر تواتر رکھتی ہے اور جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جاری کیا اور جو ابتداء سے قرآن مجید کے ساتھ ہی ظاہر ہوئی اور ہمیشہ ساتھ ہی رہیگی یا یوں کہیئے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے اور سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل۔ ابتداء سے سُنّت اللہ یہی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام لوگوں کی ہدایت کے لئے خدا کا کلام لاتے ہیں تو وہ اپنے فعل سے کلام الہیٰ کی تفسیر بھی کرتے ہیں تا کہ کلام الہیٰ کا سمجھنا لوگوں کے لئے دشوار نہ ہو اور دوسروں سے بھی اس پر اپنے عمل کے مطابق عمل کرواتے ہیں۔ پس سُنّت شریعت میں یقینی مراتب کے لحاظ سے دوسرے درجہ پر ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح قرآن مجید کی اشاعت کے لئے مامور تھے اسی طرح سُنّت کی اشاعت کے لئے بھی مامور تھے پس جب قرآن مجید یقینی ہے ایسا ہی سُنّت متواترہ معمولہ بھی یقینی ہے۔

سوم۔ حدیث۔ حدیث سے مراد وہ آثار ہیں جو قصّوں کے رنگ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ۱۵۰ سال بعد جمع ہوئے۔ حدیثیں جمع کرنے والے اگرچہ متقی اور پرہیزگار تھے اور انہوں نے ان کے جمع کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن پھر بھی انہیں ظنی مرتبہ حاصل ہے کیونکہ انہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی حاصل نہیں ہوئی۔

اِن تمام امور کے باوجود ہم احادیث کو اہل قرآن کی طرح بالکل نکمّا اور لغو نہیں کہتے کیونکہ احادیث، قرآن اور سنّتِ متواترہ کے لئے بطور گواہ ہیں اور ان کے جمع کرنے میں جس قدر احتیاط، تنقید اور تحقیق کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کی نظیر دیگر مذاہب میں نہیں ملتی۔

پس نہ تو اہل حدیث کی طرح حدیثوں کو قرآن مجید پر مقدم رکھا جائے اور نہ ہی مولوی عبداللہ چکڑالوی کی طرح احادیث کو بالکل لغو اور باطل سمجھا جائے۔ بلکہ چاہیئے کہ قرآن اور سُنّت کو حدیث پر قاضی سمجھا جائے اور جو حدیث ان دونوں کے مخالف نہ ہو اسکو بسروچشم قبول کیا جائے۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔

حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد اہل قرآن اور اہل حدیث کے جھگڑے کا بالکل فیصلہ کر دیتا ہے۔ اب نہ تو اہل حدیث کی طرح مقام حدیث میں افراط کر کے قرآن مجید کی طرف سے مُنہ پھیرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اہل قرآن کی طرح یہ کہہ کر کہ احادیث سراسر لغو ہیں اس اہم شرعی حصّہ سے اعراض کرنے کی ضرورت۔ کیونکہ بات بالکل صاف ہے۔ احادیث میں سے جو حصّہ سُنّت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اُسے ہم بوجہ اس کے کہ اسے تواتر عملی حضور کی ذات سے حضور کی زندگی سے ہی حاصل رہا ہے قبول کر لیں گے اور جو حصّہ اقوال کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ حضور کی زندگی میں جمع نہیں ہوئے بلکہ دیر بعد جمع ہوئے اس لئے انکی صحت کا کیا اعتبار۔ یا یہ کہ ان میں بہت سے خلاف قرآن و عقل واقعات درج ہیں۔ ان کے متعلق ہم یہ کہیں گے

کہ ان میں سے جو اقوال قرآن مجید اور سنت کے مطابق ہیں آپ انہیں اختیار کر لیں اور ان پر عمل کریں۔ باقی کو چھوڑ دیں۔

بہرحال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ارشاد کی روشنی میں مقام حدیث کو متعین کرنے کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل امور ثابت کرنے پڑیں گے۔

(۱) حدیث سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کا مجموعہ نہیں جیسا کہ عام اہلحدیث خیال کرتے ہیں۔ بلکہ حدیث سے مراد صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال ہیں اور حضور کے افعال سنت کہلاتے ہیں۔ اور حضور اور صحابہ ان میں فرق کیا کرتے تھے۔

(۲) سنت کو حدیث سے اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے۔

(۳) جب قرآن، سنت اور حدیث میں تعارض ہو تو مقدم قرآن، پھر سنت اور پھر حدیث ہوگی۔

سو ان تینوں امور کے متعلق خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات اور صحابہ کا عمل ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

(۱) حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں:۔

قال قالت فاطمة بنت قيس طلقني زوجي ثلاثاً على عهد النبي صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا سكنى لك ولا نفقة قال مغيرة فذكرته لابراهيم فقال قال عمر رضي الله عنه لا ندع كتاب الله وسنة نبينا لقول امرأة لا ندري احفظت أم نسيت فكان يجعل لها السكنى والنفقة۔ (ترمذی)

مغیرہ روایت کرتے ہیں کہ فاطمہ بنت قیس نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں میرے خاوند نے مجھے طلاق بتہ دیدی۔ حضور نے فرمایا۔ اب تیرے لئے خاوند کے ذمہ ایام عدت میں نہ نفقہ ہے نہ سکنیٰ۔ مغیرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے فاطمہ کی یہ حدیث ابراہیم کے پاس بیان کی۔ ابراہیم نے کہا کہ یہی حدیث فاطمہ نے حضرت عمرؓ کے پاس بیان کی تھی تو حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ ہم ایک عورت کی روایت سے جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اسے یاد بھی رہا ہے یا نہیں سنت نبوی کو نہیں چھوڑ سکتے۔۔۔ چنانچہ حضرت عمرؓ برابر فعل نبوی کی اقتدا میں مبتوتہ کو سکنیٰ اور نفقہ دلایا کرتے تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کتاب اللہ کو مقدم رکھتے اور وہ قول نبوی کے مقابل فعل نبوی کو ترجیح دیتے تھے اور یہ کہ سنت سے مراد صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے قول نہیں۔

(۲) ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کی گئی کہ نمازی کے سامنے سے عورت، کتا اور گدھا گزر جانے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؟ حضرت عائشہؓ نے ناراض ہو کر فرمایا:۔

بئس ما عدلتمونا بالكلب والحمار لقد رأيتني رسول الله صلى الله عليه وسلم وانا مضطجعة بين رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين القبلة فاذا اراد أن

یسجد غمزنی رجلی فقبضتھا

(بخاری جلد اول ہندی ص۵۶)

کہ تم لوگ ہمیں کتوں اور گدھوں کے برابر سمجھتے ہو۔ حالانکہ میں رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لیٹی ہوتی اور حضور نماز پڑھتے۔ جب سجدہ کرتے تو میرے پاؤں کو پرے ہٹا دیتے اور میں اپنے پاؤں اکٹھے کر لیتی۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں تعارض ہو تو قول کی بجائے فعل کو ترجیح دی جائے۔ صحابہؓ کا یہی دستور العمل تھا۔

اس قسم کی بے شمار مثالیں احادیث میں پائی جاتی ہیں جن کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔

اور اگر کسی وقت قرآن مجید کے ساتھ احادیث کا تعارض پیدا ہو یا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کے خلاف ہوں تو اس کے متعلق خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات موجود ہیں جن میں سے صرف دو بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں۔

کنز العمال جلد ا ص ۵ میں ہے:۔

"ستکون عنی رواۃ یروون الحدیث فاعرضوہ علی الکتاب فان وافق القرآن فخذوھا والا فدعوھا۔

اسی طرح کتاب الکفایۃ ص۴۳ میں روایت ہے:۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لیاتینکم منی احادیث مختلفۃ فما جاءکم موافقاً لکتاب اللہ وسنتی فھو

منی وما جاءکم مخالفاً لکتاب اللہ وسنتی فلیس منی"!

ان احادیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اگر کوئی حدیث معارض قرآن ہو تو وہ رد کر دی جائے اور اگر کوئی حدیث معارض سنت ہو تو بھی رد کر دی جائے اور سنت قول اور فعل نبوی میں سنت کو ارجحیت حاصل ہے۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ارشادات کی روشنی میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حدیث اور سنت با قاعدہ طور پر الگ الگ حیثیت کے حامل ہیں اور سنت کو حدیث پر فوقیت حاصل ہے اور قرآن سے تعارض کی صورت میں حدیث کو رد کیا جائے گا۔

اہل حدیث کے حدیث کے متعلق حد سے بڑھے ہوئے عقیدہ کو رد کرنے کے بعد اب ہم منکرین حدیث کو لیتے ہیں۔ ان کے مختلف گروہوں کی طرف سے انکار حدیث کے مختلف وجوہ بیان کئے جاتے ہیں:۔

اول یہ کہ وہ قرآن کی موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو جزو شرع بنانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔

دوم یہ کہ احادیث تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک عرصہ بعد جمع کی گئی ہیں اسلئے قابل قبول نہیں۔

سوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ احادیث کے جمع کرنے کی ترغیب نہیں دلائی بلکہ اس سے منع بھی فرمایا ہے۔ اسی طرح آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے بھی اس سے منع فرمایا۔

چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کے متعلق حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مراسیل ابن ابی ملیکہ سے روایت

کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے
بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ
تم لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں
روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں کو اختلاف ہے۔
اور جو تمہارے بعد لوگ ہوں گے انہیں اس سے بھی
زیادہ اختلاف ہوگا۔ اسلئے تم رسول کریمؐ سے کوئی
حدیث روایت نہ کرو۔ (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی ص۱۶۱)

اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق آتا ہے:۔
قرظہ بن کعبؓ کی روایت ہے کہ جب ہم عراق روانہ
ہوئے تو حضرت عمرؓ ہمارے ساتھ ساتھ گئے اور
فرمایا۔ میں تمہاری مشایعت اسلئے کر رہا ہوں کہ
تمہیں منع کردوں کہ وہاں کے لوگوں کے پاس احادیث
روایت کرکے ان کی تلاوت قرآن میں رکاوٹ نہ
پیدا کرنا۔ (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی ص۱۶۲)

حضرت علیؓ کے متعلق امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ:۔
اگر کتاب طویل نہ ہوجاتی تو میں تمہارے لئے بہ سند
یہ حدیث بیان کرتا کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو قبول نہیں کرتے تھے۔
(بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی ص۲۶)

اسی طرح علامہ سیوطی تنویر الحوالک شرح موطا امام
مالکؒ میں روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو خیال
آیا تھا کہ روایات کو جمع کیا جائے۔ چنانچہ اس بارہ میں
صحابہؓ سے مشورہ کیا تو انہوں نے تائید کی مگر پھر
ایک ماہ کے غور و خوض کے بعد آپ نے اس ارادہ
کو ترک کردیا۔

چہارم:۔ چوتھی وجہ احادیث کے انکار کی یہ بتائی جاتی ہے
کہ احادیث میں بے شمار ایسے واقعات روایت
کئے گئے ہیں جو سراسر قرآن مجید، عقل، اخلاق، تاریخ
اور تعامل کے خلاف ہیں۔ ان حلائل کی روشنی
میں ان کا عقیدہ ہے کہ حدیث کا قرآن پر حکم ہونا
تو ایک طرف احادیث کی اپنی حیثیت مشکوک بلکہ
معدوم ہے۔ یہ لغویات و قیاسات کا مجموعہ ہے۔
پس چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل اقوال و
افعال محفوظ ہی نہیں اسلئے ہم ان کو حجت کس طرح
بنائیں۔

اہل قرآن میں سے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی موجودگی
میں ہمیں رسولؐ کے افعال و اقوال کی سرے سے ضرورت
ہی نہیں انہیں سنت و حدیث کا قائل کرنے کے لئے قرآن کریم
سے ہی یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ وحی ما بین الدفتین کے علاوہ
افعال و اقوال رسولؐ بھی مستقلاً تا قیامت شریعت کا ایک
حصہ ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لقد کان لکم فی
رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ احکام قرآنی کے
علاوہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو افعال و اقوال رسولؐ
کی اقتداء کی بھی تاکید فرمائی ہے اور اس میں کسی طبقہ
یا زمانہ کے مومنین کی تخصیص نہیں کی بلکہ ہر زمانہ کے
مومنین مخاطب ہیں۔

۲۔ نیز فرمایا:۔ قل ان کنتم تحبون اللّٰہ
فاتبعونی یحببکم اللّٰہ (آل عمران)

نبی کی اتباع کیا ہے؟ یہی کہ جو کچھ وہ کرے
وہ کیا جائے اور جو وہ کہے اس کی اتباع کی جائے۔
سنت نبوی سے انکار اور محبت الٰہی کا دعوےٰ
دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔

۳۔ قرآن مجید سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی
حیثیت ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

ما اٰتکم الرسول فخذوہ
وما نھٰکم عنہ فانتھوا (سورۃ الحشر)

اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اوامر و نواہی کا صدور ثابت ہے۔ نہ صرف ثابت ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے صیغۂ امر استعمال کر کے اس کو اخذ کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

۴۔ نیز فرمایا:۔

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل یأمرهم بالمعروف وینههم عن المنکر ویحل لهم الطیبٰت ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم فالذین اٰمنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذی اُنزل معه فاولٰئك هم المفلحون ٥

اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاک و صاف چیزیں حلال کرنے والا اور ناپاک کو حرام کرنیوالا قرار دیا ہے اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی حلت و حرمت کی تعیین کے علاوہ شریعت میں حلال و حرام کے احکام کا ایک حصہ ایسا ہے جو اللہ کے رسول نے بیان کیا ہے پس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کا سرے سے انکار کیا جائے تو ہمیں ان تمام احکام سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض بیان فرماتے ہوئے فرمایا:۔

یتلوا علیهم اٰیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتٰب والحکمة۔

اس آیت میں تلاوت و تعلیم کلام اللہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کے کچھ اور کام بھی بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ ان تمام احکام پر مفصل روشنی ڈالی ہے ——— سنت اور حدیث کے انکار کی صورت میں حکمت، تزکیہ اور تلاوت آیات سے تعلق رکھنے والے تمام ارشادات نبوی سے ہمیں محروم ہونا پڑیگا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی تابعداری کے ساتھ رسول کے احکام کی تابعداری کو بھی فرض قرار دیا ہے۔ فرمایا:۔

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللّٰه ورسوله امراً ان یکون لهم الخیرة من امرهم ومن یعص اللّٰه ورسوله فقد ضل ضلالاً بعیداً ٥

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض فیصلے اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور بعض اس کا رسول۔ اور اللہ اور اسکے رسول کے فیصلے کے سامنے کسی مومن کو مجالِ انکار نہیں پس منکرینِ سنت و حدیث نبوی اس آیت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی و قولی فیصلوں سے انحراف کر کے ضل ضلالاً بعیداً کے مصداق بن گئے ہیں۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکم قرار دیا ہے۔ پس وحی الٰہی کی توضیح و تشریح میں حضور علیہ السلام کے اقوال و افعال ہی شرع اسلام بننے کا حق رکھتے ہیں۔ فرمایا:۔

انا انزلنا الیك الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراك اللّٰه

(النساء)

اس آیت سے تین باتیں معلوم ہوئیں:۔

اتحکیم بین الناس فرائض رسالت میں شامل ہے۔
۲۔ نزولِ کتاب سے ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ اسکے
ذریعہ نبی یا اس کے بعد کے حاملینِ کتاب فیصلے کریں۔
۳۔ نبی کے فیصلے اللہ تعالیٰ کی زیرِ نگرانی اور اس کی ہدایت
کے مطابق ہوتے ہیں۔

جب نبی کے فیصلے اللہ تعالیٰ کی زیرِ نگرانی اور اسکی ہدایت
کے مطابق ہوتے ہیں اور اس میں بشریت کا دخل نہیں ہوتا تو
نبی کے اقوال و افعال لازماً جزوِ شرع بھی ہیں۔ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے
ہیں فرمایا ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ
کہ آپ کے تمام ارشادات وحی الٰہی کی روشنی میں ہوتے
تھے بس آپ کے افعال و اقوال سے انکار وحی الٰہی کے
بہت بڑے حصہ سے انکار کرنا ہے۔ قرآن مجید سے مزید
ثبوت بھی مہیا کئے جا سکتے ہیں مگر ہم انہیں پر اکتفا کرتے
ہیں۔ مندرجہ بالا آیات سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے
کہ اہلِ قرآن کا یہ عقیدہ کہ قرآن کے بعد آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے افعال و اقوال کی ہمیں قطعاً کوئی ضرورت
نہیں غلط ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال مسلمانوں کیلئے واجب الاتباع
ہیں کیونکہ ان سے زیادہ قرآن کریم کو سمجھنے والا اور کوئی نہیں
ہو سکتا۔ گو یہ دلیل اب بہت پرانی ہو چکی ہے تاہم اب تک
اہلِ قرآن اس کا جواب نہیں دے سکے کہ اگر افعال و اقوالِ
رسول بالکل ہی متروک اور ناقابلِ عمل ہیں تو یہ فرمائیے
کہ نماز و وضوء کا طریق اور حج و روزے اور زکوٰۃ کے
تفصیلی احکام قرآن میں کس جگہ بیان ہوئے ہیں؟

پس یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ قرآن کے پہلے اور سب سے
بڑے مفسر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال
ترک کر کے اسلام کا صحیح چہرہ نہیں دیکھا جا سکتا۔

اب ہم اہلِ قرآن کے دوسرے اعتراض کو لیتے ہیں
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ
اور حضرت علیؓ نسب ہی تدوینِ حدیث کے خلاف تھے۔
اس سلسلہ میں کوئی حوصلہ افزائی کرنا تو دور کی بات ہے۔

اس اعتراض کا ایک جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس وقت
قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اسلئے اس خیال سے کہ کہیں حدیث
و قرآن میں اشتباہ نہ ہو جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اور حضرت عمرؓ نے
تدوینِ حدیث کی اجازت نہ دی۔ پھر اس وقت بڑا مقصد
تعلیم قرآن تھا۔ تعلیمِ حدیث حضورؐ کی ذات کے ذریعہ
خود بخود ہو رہی تھی۔ مگر اس کا ایک جواب ہم یہ پیش
کرتے ہیں کہ تدوینِ حدیث کی ممانعت عام لوگوں کیلئے
تھی نہ کہ خاص لوگوں کے لئے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ
حضرت علیؓ اور ابو شاہ کی لکھی ہوئی احادیث کا تذکرہ موجود
ہے۔ حضرت امام بخاریؒ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت
کرتے ہیں کہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں بہت احادیث بیان کرتا
ہوں حالانکہ مجھ سے زیادہ عبد اللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں۔
وجہ یہ ہے کہ میں اَن پڑھ تھا اس لئے زبانی یاد رکھتا تھا اور
وہ لکھ لیا کرتے تھے۔

اندازہ لگائیے کہ اس زمانہ میں کس حد تک احادیث
جمع ہو چکی تھیں کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ سے قریباً ساڑھے چار ہزار
احادیث مروی ہیں۔ لہٰذا عبد اللہ بن عمروؓ کی احادیث کی
تعداد اس زمانہ میں یقیناً اس سے زیادہ ہوگی۔

اسی طرح ترمذی اور ابو داؤد میں حضرت عبد اللہ بن
عمروؓ سے روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
زندگی میں احادیث لکھ لیا کرتا تھا۔ اس پر مجھے بعض لوگوں
نے منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہیں کبھی غصے میں
بھی بات کرتے ہیں تم سب باتیں نہ لکھا کرو۔ اس پر میں نے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا تذکرہ کیا تو آپ
نے فرمایا

"خدا کی قسم میرا ہر فعل اور قول خدا تعالیٰ کے منشا کے مطابق ہوتا ہے"

یعنی تم اس خیال سے احادیث لکھنے سے کیوں رُکتے ہو لکھتے جاؤ۔ میرا ہر قول وفعل اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق ہے۔

حضرت علیؓ کے متعلق جو آتا ہے کہ وہ احادیث پر اعتبار نہ کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی طبیعت میں احتیاط کا پہلو بہت زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے وہ عام راویوں کی احادیث پر اعتبار نہ کرتے تھے ورنہ یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ وہ مطلقاً احادیث نبویہ کے منکر تھے۔ انکار روایات لینا ثابت ہے صرف احتیاط کے لئے وہ ہر راوی سے قسم لے لیا کرتے تھے۔ بخاری میں خود حضرت علیؓ کی روایت آتی ہے کہ ہمارے پاس اس قرآن اور اس صحیفہ کے احکام ہیں ــــــ یہ صحیفہ حضرت علیؓ کا اپنا تیار کردہ تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث درج تھیں۔ نہ معلوم یہ لوگ کس طرح ایسے شخص کے متعلق یہ بات کہہ دیتے ہیں جو خود احادیث کا مجموعہ تیار کرتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی طبیعت میں بھی یہی احتیاط تھی ورنہ ان دونوں کی احادیث موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حدیث بیان کرنے والے سے گواہ طلب فرماتے تھے تب جا کر حدیث قبول کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا اپنی ذات کے متعلق احتیاط کا ایک واقعہ علامہ بلاذری نے انساب الاشراف میں بیان کیا ہے کہ لوگوں نے ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:۔

"لولا انی اکرہ ان ازید فی الحدیث او انقص لحدثتکم بہ"

کہ اگر مجھے حدیث میں کمی بیشی ناپسند نہ ہوتی تو میں ضرور حدیث بیان کر دیتا۔"

جس شخص کا اپنی ذات کے متعلق احتیاط کا یہ عالم ہے اس کا دوسرے صحابہؓ کے متعلق احتیاط کا کیا حال ہوگا۔ تذکرۃ الحفاظ جلد۱ میں لکھا ہے:۔

"ان عمر استشارھم فی املاص المرأۃ یعنی السقط فقال لہ المغیرۃ قضی فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بغرۃ فقال لہ عمر ان کنت صادقاً فایت احداً یعلم ذلک قال فشہد محمد بن مسلمۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی بہ"

پس ان اصحاب کی طرف یہ منسوب کرنا کہ وہ جمع حدیث کے خلاف تھے درست نہیں۔ بلکہ حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ حدیث کو جمع کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کا حکم دیتے تھے تاکہ جس حد تک ہوسکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی روایت ہوں ورنہ انکار جمع حدیث ان سے کسی جگہ بھی ثابت نہیں۔

منکرین حدیث کا یہ دعویٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ حدیث کے جمع کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی بلکہ اس سے منع فرمایا قطعاً لاعلمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس علم کے سب سے پہلے بانی اور مؤسس ہیں۔ چنانچہ علم حدیث کا بنیادی اصول خود آپؐ کا ارشاد فرمودہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"ستکون عنی رواۃ یروون الحدیث فاعرضوہ علی الکتاب فان وافق القرآن فخذوہ والا فدعوہ۔"

(کنز العمال جلد۱ صفحہ۵)

عنقریب ایسے رواۃ پیدا ہوں گے جو تمہارے پاس میری طرف منسوب کر کے بعض احادیث بیان کریں گے۔ ایسی احادیث کو قرآن پر پیش کر کے موازنہ کر لینا اگر اس کے موافق ہے تو لینا ورنہ ترک کر دینا۔ بلکہ اس سے اگلا قدم بھی آپ ہی اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ کتاب الکفایہ صفحہ ۴۳۰ پر یہ روایت آتی ہے:۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لیاتیکم منی احادیث مختلفۃ فما جاءکم موافقاً لکتاب اللہ وسنتی فھو منی وما جاءکم مخالفاً لکتاب اللہ وسنتی فلیس منی"

کہ پہلی چیز قرآن ہے پھر سنت ہے۔ اگر کوئی حدیث ان دونوں کے موافق ہے تو قابل قبول ہے ورنہ قابل ترک۔

حیرت ہے ان لوگوں پر جو حدیث کا انکار کرتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کی کتابت منع فرمائی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس علم کے بنیادی اصولوں کے واضع ہی آپ ہیں۔ اور آپ نے نہ صرف یہ کہ اپنے زمانہ کے خاص خاص صحابہ کو احادیث لکھنے کی اجازت دی اور عام روایت احادیث کی بھی اجازت دی بلکہ یہ بھی بتایا کہ عنقریب میری احادیث جمع کی جائینگی تم ان سے یہ لینا اور یہ نہ لینا۔

اب اہل قرآن کا تیسرا اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے کہ بے شک احادیث باقاعدہ صورت میں ایک عرصہ کے بعد مدون ہوئیں مگر انکی چھان پھٹک جن اصولوں پر ہوئی ہے وہ اس درجہ مکمل اور سائنٹفک ہیں کہ آج بھی یورپ کے مستشرقین ان محدثین کی ذہنی کاوشوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے۔ چنانچہ محدثین کی اسی کاوش کا نتیجہ ہے کہ احادیث میں بے شمار ایسی صداقتیں پائی جاتی ہیں جنکو تاریخ، نئی تحقیق اور ..... فعل الٰہی نے ثابت کر کے محدثین کے طریق کار کے اعلیٰ معیار پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

تاریخی ثبوت کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط پیش کیا جا سکتا ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل شاہ روم کی طرف لکھا اور جسے حضرت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں بعد بسیار تحقیق روایت کیا اور جسے آج کی تحقیق نے حرف بحرف درست ثابت کر دکھایا۔

نئی سائنسی تحقیق کی رو سے بھی احادیث میں کثرت سے ایسی صداقتیں پائی جاتی ہیں جو سینکڑوں سال کے بعد حرف بحرف پوری ہوئیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غروب آفتاب کے وقت حضرت ابوذرؓ سے فرمایا۔ اے ابوذر کیا تمہیں معلوم ہے سورج کہاں جا رہا ہے؟ عرض کی اللہ ورسولہ اعلم۔ فرمایا "تذھب حیث تطلع" یا "تغرب حیث تطلع" کہ یہ سورج جہاں غروب ہو رہا ہے وہیں سے طلوع ہو رہا ہے۔

اس زمانہ میں لوگ یہی سمجھتے تھے کہ سورج ادھر سے نکلا اور ادھر غروب ہو گیا۔ دوسری دنیا کا انہیں علم ہی نہیں تھا۔ لیکن امریکہ کی دریافت اور زمین کی گردش کی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا کہ سورج کا طلوع و غروب محض اضافی ہے سائنس نے تو یہ بات اب بیان کی لیکن ہمارے آقا نے سینکڑوں سال پہلے بیان فرما دی۔ اللھم صل علی محمد و علی آل محمد۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار پیشگوئیاں احادیث میں پائی جاتی ہیں جن میں سے سینکڑوں اپنے وقت پر اسی طرح پوری ہوئیں جس طرح وہ کتب احادیث میں روایت کی گئیں۔ مثلاً امت میں فساد، خروج یاجوج و ماجوج، اور مسیح و مہدی سے تعلق رکھنے والی سینکڑوں پیشگوئیاں اپنے وقت پر حرف بحرف پوری ہوئیں۔

پس جب تاریخی اور سائنسی تحقیقات اور اللہ تعالیٰ کی فعلی شہادت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کتب احادیث میں بے شمار صداقتیں پائی جاتی ہیں۔ تو یہ کہنا سراسر ظلم ہے کہ

الفرقان

احادیث ایک لمبا عرصہ بعد جمع کئے جانے کی وجہ سے ناقابلِ اعتبار ہیں اور ان کو کسی صورت میں بھی جزو شرع اسلام نہیں بنایا جا سکتا۔

چوتھی وجہ کا جواب یہ ہے کہ اصولِ حدیث (جسمیں روایت درایت پر بحث ہوتی ہے) ایک مستقل عنوان ہے جس پر اس مختصر وقت میں بحث نہیں ہو سکتی۔ بہرحال ہمارے پاس کسی حدیث کی صحت کو جانچنے کے لئے اصولِ حدیث (روایت و درایت) کی کسوٹی موجود ہے۔ جو حدیث اس پہ پوری اُترے وہ قابلِ قبول ہے ورنہ قابلِ ردّ ——— تو فرمایئے کہ اگر ایک بات ایک عرصہ کے بعد لکھی جائے اور ہو قرآن و سُنّت کے مطابق تو اس پر عمل کرنے سے کیسے انکار ہو سکتا ہے ——— ہاں یہ ضرور ہے کہ احادیث سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے اور جب تک کسی حدیث کو قولی یا عملی تواتر حاصل نہ ہو یا قرآن اور سُنّت اس کے مؤیّد نہ ہوں یا قرآن اور سُنّت یا ان دونوں کے موافق احادیث میں اس کے خلاف حکم نہ پایا جاتا ہو اس وقت تک وہ قابلِ عمل نہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے افراط و تفریط کو چھوڑ کر جو صراط مستقیم مسلمانوں کو دکھایا ہے آخر اس کا اقرار اہلِ قرآن کو بھی بادلِ ناخواستہ کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ ادارہ طلوع اسلام کی کتاب "مقام حدیث" ص٢٧٩ میں علامہ تمنا عمادی فرماتے ہیں:-

"آخر میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں ان حدیثوں کو جو قرآن مبین کے مطابق ہیں اور اسی وجہ سے انکی نسبت رسول اللہ صلعم کی طرف صحیح ہو سکتی ہے قرآن مجید کی تفسیر سمجھتا ہوں اور اُن کی دینی اہمیت پوری طرح جانتا اور مانتا ہوں میں خود قرآن کی تفسیر اپنی سمجھ کے مطابق کروں مجھ کو اس کا حق ہے مگر رسول اللہ صلعم جو قرآن مجید کی تبلیغ و تعلیم و تبیین ہی کے لئے مبعوث ہوئے ان کو قرآنی آیات کی تفسیر بیان فرمانے کا کوئی حق نہ تھا؟ کوئی صاحبِ عقلِ سلیم ایسا نہیں سمجھ سکتا مگر تفسیر کو متنِ قرآن کے سیاق و سباق کے مطابق اصولِ ادبِ عربی کے مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ "من چہ می سرائم و طنبورہ من چہ می سرائد" کی مصداق ہو۔ جب کوئی حدیث صحیح یعنی مطابق قرآن مجھے مل جاتی ہے تو میں اس سے سرتابی کفر سمجھتا ہوں"

ہمارے اس مقالہ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اہلِ حدیث کی حد درجہ بڑھی ہوئی خوش فہمی درست نہیں اور اہلِ قرآن کا ضرورت سے زیادہ تشدد بھی نادرست ہے! اور اصل بات یہ ہے کہ نہ تو احادیث قرآن پر حکم ہیں! اور نہ اس درجہ ساقط الاعتبار کہ وہ کسی صورت میں بھی شریعت کا جزو نہیں بن سکیں۔ ہمارے نزدیک احادیث کا مقام یقینی طور پر اس مرتبہ کا حامل ہے کہ انہیں قرآن و سُنّت کی اتباع میں شریعتِ اسلامیہ کا حصہ قرار دیا جائے۔ حدیث نبوی سے انحراف سراسر خسران و تباب ہے*

موجودہ عیسائی عقائد حضرت مسیح ناصری کی تعلیمات کے یکسر خلاف ہیں

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے عیسائی محققین کا تبصرہ

(از جناب شیخ عبدالقادر صاحب لائل پوری)

(۱)

مشہور مسیحی عالم دینیات ریورنڈ چارلس اینڈرس اسکاٹ اپنے مقالہ مندرجہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (بعنوان Jesus) میں رقمطراز ہیں:-

"پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا۔ ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی وحی سے فیضیاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک غیر منقطع تعلق رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے۔ اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف لیجا کر ملامت[۱] کی (متی $\frac{16}{22}$) لوقا میں

ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ خدا اور ساری اُمت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا (لوقا $\frac{24}{19}$) یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اگرچہ مرقس کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لئے لفظ "خداوند" (Lord) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لئے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسوع کے ابتلاء (حادثہ صلیب) کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں۔ جیسا کہ اس واقعہ کے شایان شان ہے۔ مگر مرقس کی "فدیہ" والی عبارت (مرقس $\frac{10}{45}$) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے جو بعد میں پہنائے گئے۔ حتیٰ کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک

---

[۱] پطرس کے اس طرز خطاب سے ظاہر ہے کہ وہ یسوع مسیح کو خدا نہ سمجھتا تھا۔

نہیں کیا گیا۔ کہ یسوع کی موت کا گناہ یا کفارہ سے کوئی تعلق تھا"
آگے چل کر پھر لکھا ہے :۔
"یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپکو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا $\frac{13}{33}$) وہ اکثر اپنا ذکر "ابن آدم" کے نام سے کرتا ہے ..... یسوع کہیں اپنے آپکو "ابن اللہ" نہیں کہتا اور اس کے دوسرے ہمعصر بھی جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو "مسیح" سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپکو مطلقاً بیٹے کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے ..... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لئے بھی "باپ" کا لفظ اسی اطلاق شان میں استعمال کرتا ہے ..... اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپکو منفرد نہیں سمجھتا بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعہ نے اُسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا۔ کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے"
پھر یہی مصنف لکھتا ہے :۔
"عید پنتکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے

تھا" یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہمعصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے ..... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو بھوک لگتی تھی۔ وہ تھکتا اور سوتا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافت حوال کا محتاج تھا۔ اس نے دُکھ اٹھایا اور مرا۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونیکا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے ..... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس دعویٰ کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثناء تھا تو صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بناء پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادر مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر

خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ
بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم
کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی
اور ذریعہ سے نہیں ٹل سکتی" اس بات کا
صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات
قطعاً خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقعہ یہ بات
ان انجیلوں کی تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے
کی ایک اہم شہادت ہے۔ کہ اگرچہ ان
کی تصنیف و ترتیب اس زمانے سے
پہلے مکمل نہ ہوئی تھی۔ جبکہ مسیحی کلیسیا نے
مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی
ان دستاویزوں میں ایک طرف
مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے
کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری
طرف ان کے اندر کوئی شہادت
اس امر کی موجود نہیں کہ مسیح اپنے
آپ کو خدا سمجھتا تھا۔"

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے:۔

"وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا
کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے
ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے
ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا
گیا ..... یہ "ابن اللہ" کا لفظ یقینی
طور پر ذاتی ابنیت کی طرف ایک اشارہ
اپنے اندر رکھتا ہے۔ جیسے پال نے دوسری
جگہ یسوع کو "خدا کا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا
ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ
آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا۔ یا
پال تھا جس نے مسیح کے لئے لفظ "خداوند"
کا خطاب اصل مذہبی معنے میں استعمال
کیا۔ شاید یہ فعل مقدم الذکر گروہ ہی کا ہو۔
لیکن بلا شبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب
کو پورے معنے میں بولنا شروع کیا۔ پھر
اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح
کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیح" کی طرف
بہت سے وہ تصورات اور اصطلاحی الفاظ
منتقل کر دیئے جو قدیم کتب مقدسہ میں خداوند
یہوواہ (اللہ تعالیٰ) کے لئے مخصوص تھے۔
اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش
اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور
اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم
متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے
مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے
باوجود پال بھی اس کو قطعی طور پر
اللہ کہنے سے باز رہا۔"

(۲)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون
"مسیحیت" میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسیا کے
بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی
ہے۔ اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی
گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لئے
ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات
بائیبل کے اور ڈھلے ہوئے ہیں ایک اجنبی
فلسفے کی صورتوں میں۔

باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں
یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری
اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذ و نادر ہی

کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اسکو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد نہ یہودی ہے اور مسئلہ خالص یونانی۔ (اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے پہلے یہ مواد بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا۔)

اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی۔ بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا۔ یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ، بیٹا، روح القدس) کے درمیان تعلق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسیا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدہ میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا۔ اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے[1]۔"

(۳)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ایک اور مضمون "تاریخ کلیسیا" (Church History) کے نام سے دیا گیا ہے اس مضمون کی مندرجہ ذیل عبارت اس سلسلہ میں قابلِ ملاحظہ ہے:۔

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام کا جسدی ظہور" تو مان لیا گیا تھا۔ تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں۔ جن سے کلیسیا کی بنیادیں ہل گئیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل نے الوہیتِ مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیہ ہی کے فیصلہ کی ہوئی۔ جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیئے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزوِ لاینفک قرار دیا گیا۔

پھر اس دعویٰ پر کہ "بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسم ہوئی تھی" ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا۔ جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں۔ ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت۔ اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری

[1] اقتباسات معارف القرآن جلد سوم سے لئے گئے ہیں۔

کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں۔ یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف مشیتوں کا حامل ہے ۔۔۔۔۔۔ اسی دوران میں مغربی کلیسیا نے گناہ اور فضل وکرم کے مسئلہ پر خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیر بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخر کار ۵۲۹ء میں "اورنیج" کی دوسری کونسل میں ۔۔۔۔۔ یہ نظریہ اختیار کیا گیا۔ کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا۔ جب تک وہ اس فضل خداوندی سے جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے۔ نئی زندگی نہ حاصل کرلے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضل خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے اور فضل خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسیا ہی کے توسط سے حاصل رہ سکتی ہے[۵۵]"

(۴)

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں "بائبل" پر جو مقالہ درج ہے اس میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ مختلف ادوار میں نئے عہد نامہ کے اندر موجود الوقت عیسائی عقائد کے پیش نظر ردوبدل کئے جاتے رہے مثلاً مرقس کے آخر میں بارہ آیات کا اضافہ کر دیا گیا جن میں حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے آسمان پر جانے اور خدا کے دہنے ہاتھ بیٹھنے کا ذکر ہے۔ اور اسی طرح یہ ذکر ہے کہ آپ کی تعلیم (بنی اسرائیل کے لئے مخصوص نہیں بلکہ) دنیا کی سب قوموں کے لئے عام ہے۔ ان آیات میں مسیح کے حاضر و ناظر ہونے کا بھی اشارہ موجود ہے۔

مقالہ نویس نے ان آیات کو یقینی شواہد کی رُو سے بعد کا اضافہ ثابت کیا ہے اور اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ انکشاف یہ کیا گیا ہے کہ ۱۸۹۱ء میں انجیل مرقس کا جو نسخہ آرمینیا سے برآمد ہوا۔ اس میں یہ آیات "ارسٹن" کی طرف منسوب ہیں۔ (یعنی یہ آیات ارسٹن نے لکھ کر انجیل کے ساتھ شامل کر دیں) ورنہ قدیم مستند نسخوں میں یہ آیات پائی نہیں جاتیں۔ مقالہ نویس جو کہ ایک مشہور بائیبل سکالر ہیں لکھتے ہیں :-

> "مرقس کے آخر میں جو اہم ترین ردوبدل کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ تحقیق یقیناً درست معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ قدیم ترین یونانی نسخے اور قدیم سریانی ترجمہ پر مشتمل بہترین نسخہ اور اسی طرح بعض دوسرے مستند نسخے مرقس کی آخری بارہ آیات کو درج نہیں کرتے اور یہ انجیل ان نسخوں میں ۱۶ باب ۸ آیت پر ختم ہو جاتی ہے۔"

علاوہ ازیں اسی مقالہ میں یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ لوقا کے آخر میں مسیح کے آسمان پر جانے کا ذکر بعد میں شامل کیا گیا ہے اور اس بیان کے علاوہ سات آٹھ مزید الحاقی فقرات کا اضافہ بھی ہوا ہے جن میں سے ایک فقرہ میں حواریوں کی طرف سے مسیح کو سجدہ کرنے کا ذکر ہے مقالہ نویس

---

۵۵ ماخوذ از رسالہ ترجمان القرآن بحوالہ معارف القرآن جلد سوم

نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اعمال الرسل کے شروع میں حضرت مسیح کے آسمان پر جانے کا ذکر بھی الحاقی ہے۔ اور اسی شخص نے یہ بیان داخل کیا جس نے لوقا کے آخر میں الحاقات روا رکھے۔ مزید برآں اور بھی کئی مثالیں دینے کے بعد کہ اناجیل بعد میں آنے والے عیسائیوں کی طرف سے تحریف و الحاق کا تختۂ مشق بنائی گئیں لکھا ہے:۔

"اناجیل میں خصوصیت سے دیدہ و دانستہ ردّ و بدل کئے گئے۔ مثلاً پوری کی پوری عبارتیں بڑھا دی گئیں۔ ان میں سے بعض یقینی طور پر باہر سے شامل کی گئیں ... . اس ردّ و بدل کی وضاحت کے لئے کوئی تسلی بخش قدیم شواہد آج تک نہیں مل سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ ردّ و بدل خاص مقصد سے کیا گیا ہے۔ اور ایسے اشخاص کے ذریعہ ہوا ہے جن کے پاس انجیل میں اضافہ کرنے کے لئے نیا مواد موجود تھا۔ اور اس کام میں انہیں کوئی باک محسوس نہیں ہوا۔ طویل الحاقات اور چھوٹے ردّ و بدل ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ یہ املائی غلطیاں نہیں بلکہ ان کے ذریعہ اصل عبارت کو دیدہ و دانستہ درست کرنا یا اس پر اضافہ کرنا مقصود تھا۔ یہ سب الحاقات دوسری صدی کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔" (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ایڈیشن ۱۵ جلد ۳ صفحہ ۵۱۷، ۵۱۹، ۵۲۱)

اِن اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ اپنے بنیادی عقائد کے متعلق عیسائی محققین کی موجودہ روش کیا ہے؟ اس سے اندازہ لگتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آنے والے انقلاب روحانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کتنا سچ فرمایا ہے کہ ؎

آسماں پر دعوتِ حق کے لئے اِک جوش ہے
ہو رہا ہے نیک طبعوں پر فرشتوں کا اُتار

آ رہا ہے اس طرف احرارِ یورپ کا مزاج
نبض پھر چلنے لگی مُردوں کی ناگہ زندہ وار

کہتے ہیں تثلیث کو اب اہلِ دانش الوداع
پھر ہوئے ہیں چشمۂ توحید پر از جاں نثار

آ رہی ہے اب تو خوشبو میرے یوسف کی مجھے
گو کہو دیوانہ میں کرتا ہوں اس کا انتظار

ایک علمی مقالہ

فنِ صحافت کی رُو سے "خبر" کی تعریف

17

ماہ مارچ کے آغاز میں احمدیہ انٹرنیشنل پریس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک علمی مجلس میں جناب مسعود احمد صاحب نے ذیل کا مقالہ پڑھا، اسے افادۂ عام کے لئے شائع کیا جاتا ہے ——— (ایڈیٹر)

خبروں کو فی زمانہ اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ ہر شخص صبح اُٹھتے ہی اخبارات کی طرف دوڑتا ہے تاکہ معلوم کرے کہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اُس کے اپنے شہر اور ملک میں، آس پاس کے ممالک اور دُنیا بھر کے دُور دراز علاقوں میں کیا کچھ واقعات رونما ہوئے ہیں اور وہ کس حد تک اس کی اپنی اور دوسرے انسانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والے ہیں۔ حالات معلوم کرنے کی یہ خواہش اور یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ پڑھے لکھے تو الگ رہے بعض اَن پڑھ لوگ بھی جب تک اخبار کی خبریں دوسروں سے نہ سُن لیں یا اُن کا خلاصہ ریڈیو بلیٹن کے ذریعہ اُن تک نہ پہنچ جائے اُن کو چین نہیں آتا۔

تعریف کے تعین کا سوال

خبروں اور اخبارات کی اس ہمہ گیر مقبولیت کے باوجود یہ امر ابھی تک عوام تو عوام خود ماہرین فن کے نزدیک بھی پورے طور پر طے نہیں ہو سکا ہے کہ خبر کی صحیح تعریف کیا ہے۔ روزمرہ کے واقعات میں سے ہر اخبار نویس اپنی تربیت یافتہ حس کی مدد سے اُن واقعات کو فوراً الگ کر لیتا ہے کہ جو خبروں کی ذیل میں آتے ہیں اور انہیں ترتیب دے کر اخبار کی شکل میں قارئین تک پہنچا دیتا ہے لیکن یہ امر اُس کے اپنے لئے بھی کارِ دارد ہے کہ وہ خبر کی کوئی ایسی جامع اور ہمہ گیر تعریف بیان کر سکے کہ جس کی بنیاد پر ہر واقعہ کو اس لحاظ سے پرکھا جا سکے کہ اس میں اخباریت کس حد تک موجود ہے۔ فنِ صحافت کے بڑے بڑے ماہروں نے ایسی تعریفیں وضع کرنے میں بہت سر مارا ہے کہ جن میں خبریت کا عنصر کلی طور پر محصور ہو سکے اور جن کی مدد سے حتمی طور پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کوئی واقعہ خبر کے ذیل میں آتا ہے یا نہیں۔ لیکن خود انہی ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

کہنے کو ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ اگر کسی واقعہ کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جائے تو وہ خبر بن جاتا ہے۔ گویا ایک عام آدمی کی نگاہ میں کسی واقعہ کی رپورٹ خبر کہلاتی ہے لیکن اگر بات اتنی ہی ہوتی تو فنِ صحافت کے ماہروں کے لئے الفاظ کی شکل میں خبر کی تعریف متعین کرنا چنداں مشکل امر نہ ہوتا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کسی واقعہ کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جائے یا مخصوص الفاظ میں اسے دوسروں تک پہنچا دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ ہر واقعہ رپورٹ کے قابل نہیں ہوتا۔ صرف وہی واقعہ یا واقعہ کا وہی حصہ رپورٹ کیا جائے کہ جس کو معلوم کرنے کے عوام متمنی ہوں اور اگر پہلے سے متمنی نہ بھی ہوں تو کم از کم جب وہ اس کو پڑھیں تو اُن کا دل گواہی دے کہ اخبار نے بہت اچھا کیا جو یہ واقعہ ہم تک پہنچا دیا اور اگر نہ پہنچاتا تو ہم نقصان میں رہتے۔ سو جب معاملہ لوگوں کی خواہش اور احساس کا ہو تو اس بارے میں کوئی حتمی اصول

یاقاعدہ متعین کرنا انسان کے بس میں نہیں رہتا۔ کیونکہ
خواہشات اور احساسات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں اور
اُن کے زیر اثر واقعات کی اہمیت کا بدلنا بھی لازمی ہے۔
پھر ہر علاقے اور ملک کے لوگوں کے حالات مختلف ہوتے
ہیں۔ ایک واقعہ ایک مخصوص علاقے کے لوگوں کے لئے
اہم ہوتا ہے لیکن دوسرے علاقے کے لوگوں کے لئے وہ
قطعاً اپنے اندر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر ایک واقعہ
ایک خاص وقت اور زمانے میں لوگوں کے لئے اہم ہوتا ہے
لیکن اسی نوعیت کا واقعہ کچھ عرصہ کے بعد لوگوں کی نگاہ میں
اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ پھر وہ خبر کی ذیل میں نہیں آسکتا۔
زمانہ اس سرعت سے بدل رہا ہے اور انسانی زندگی کے حالات
میں اس قدر تیزی سے تبدیلی واقع ہو رہی ہے کہ کسی خاص
نوعیت کے واقعات پر حصر کرنا کہ وہ ضرور ہی خبر کے
ذیل میں آتے ہیں ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک
خبر کی جتنی تعریفیں بھی وضع کی گئی ہیں وہ ناکافی ثابت
ہوتی رہی ہیں۔ روزانہ ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے
ہیں کہ جو ماہرین کی وضع کردہ تعریفوں کے ذیل میں نہیں
آتے لیکن لوگوں کی نئی نئی خواہشات اور بدلتے ہوئے
احساسات کے پیش نظر اُن کا خبر کے ذیل میں آنا ناگزیر
ہوتا ہے۔

ماہرین کی وضع کردہ بعض تعریفیں

اب ہم مثال کے طور پر ماہرین کی وضع کردہ بعض تعریفوں کو لیتے ہیں۔ ایک زمانے
میں امریکہ کے مشہور اخبار نویس ولیم اروِن نے خبر کی
تعریف بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ ہر وہ چیز جو معمول کے
خلاف ہو خبر کہلاتی ہے۔ اسی خیال کو انگلستان کے نامور
اخبار نویس لارڈ نارتھ کلف نے نہایت دلچسپ انداز
میں یوں بیان کیا تھا کہ اگر ایک کتا کسی آدمی کے کاٹ لے
تو یہ کوئی خبر نہیں ہے کیونکہ کتے کاٹا ہی کرتے ہیں لیکن اگر
اگر کوئی آدمی طیش میں آکر کسی کُتے کے کاٹ لے تو پھر یہ
یقیناً خبر ہے۔ اس تعریف کی رُو سے معمول کے مطابق جو
کام ہوتے ہیں وہ خبر کے ذیل میں نہیں آتے تاوقتیکہ
کوئی بات معمول کے خلاف واقع نہ ہو وہ اس قابل
نہیں ہے کہ اُسے اخبار میں خبر کے طور پر درج کیا جائے۔
اس میں شک نہیں کہ ہر وہ واقعہ جو معمول کے خلاف ہو اپنے
اندر اخباریت رکھتا ہے اور یقیناً لوگ اُسے دلچسپی سے
پڑھیں گے لیکن بعض معمولات بھی ایسے ہوتے ہیں جن کو
لوگ جاننا چاہتے ہیں اور اگر اُن کو اُن معمولات کا علم
نہ ہو تو اُن کو تشویش لاحق ہو گی۔ آخر بعض معاملات میں
لوگ یہ بھی تو جاننا چاہتے ہیں کہ All is well
کہ سب حالات ٹھیک ٹھاک ہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔
مثال کے طور پر سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ
ہر جمعہ کو خطبہ ارشاد فرماتے ہیں یہ امر حضور کے معمولات
میں داخل ہے۔ یہ خطبہ ہفتہ عشرہ میں مرتب ہو کر چھپ جاتا
ہے۔ اب وقتی طور پر صرف یہ اطلاع کہ حضور نے خطبہ
ارشاد فرمایا خبر کی مذکورہ بالا تعریف کی رُو سے خبر نہیں
کہلا سکتی لیکن الفضل کے قارئین جو ربوہ سے باہر رہتے
ہیں یقیناً اس خبر کے بھی منتظر رہتے ہیں اور رہا چاہتے ہیں کہ
اس معمول کا بھی انہیں علم ہوتا رہے۔ اگر کسی جمعہ کے متعلق
انہیں یہ اطلاع نہ ملے کہ حضور نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور
خطبہ ارشاد فرمایا تو انہیں فکر لاحق ہو گا کہ نہ معلوم حضور نے
خطبہ ارشاد فرمایا یا نہیں کہیں اچانک طبیعت ناساز نہ
ہو گئی ہو۔ اسی طرح دنیا کے اور بہت سے معمولات
ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے متعلق لوگ جاننا چاہتے ہیں۔
اس لحاظ سے خبر کی یہ تعریف بھی نامکمل اور ادھوری ہے۔
پھر اس امر کو تو سب ماہرین نے تسلیم کیا ہے کہ ہر
تعجب انگیز واقعہ یا امر خبر ہے چنانچہ ایڈورڈ ڈبلیو
باؤ نے لکھا ہے:-

"News is anything that will make a woman say "For Heavens Sake."

یعنی ہر وہ بات خبر ہے کہ جسے سُن کر ایک عورت پکار اُٹھے کہ الٰہی توبہ!

اب اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہر تعجب انگیز چیز خبر کے ذیل میں آتی ہے لیکن آجکل کی دُنیا میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے متعلق لوگ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان میں حیرت و استعجاب کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر صدر مملکت کسی نجی کام کے سلسلے میں لاہور آتے ہیں سو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حکام سرکاری کی کاموں کے سلسلے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک اہم شخصیت کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بھی خواہ وہ کسی نجی کام کے سلسلے میں ہی ہو لوگوں کیلئے اہمیت رکھتا ہے اور وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اُن کا لیڈر یا قائد آج کس شہر میں ہے اور اس کی مصروفیات کیا ہیں۔ چنانچہ لیڈروں کے دَوروں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کے متعلق ہم خبریں پڑھتے ہی رہتے ہیں اور بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اہم شخصیتوں کی ہر حرکت و سکون خبر کا درجہ رکھتی ہے اسمیں حیرت یا استعجاب کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہاں لوگوں کو اُن سے لگاؤ ہوتا ہے اور وہ انکی مصروفیات اور پروگرام کے متعلق بہرصورت علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پس خبر کو اس تعریف میں ہی محصور سمجھنا کہ ہر وہ واقعہ یا امر خبر کہلاتا ہے کہ جسمیں حیرت و استعجاب کا پہلو موجود ہو درست نہیں ہے اور خبر کی یہ تعریف بھی مکمل نہیں کہلا سکتی۔

انہی مشکلات سے دوچار ہونے کے باعث بعض ماہرین نے خبر کی ایک نئی تعریف وضع کی اور لکھا:۔

"News is such an account of such events as a first rate newspaper-man, acting as such, finds satisfaction in writing and publishing it." (Gerald W. Johnson)

یعنی "خبر اُن واقعات کے بیان پر مشتمل ہوتی ہے جن کے متعلق ایک اعلیٰ درجہ کا اخبار نویس اس حیثیت سے اپنا فرض انجام دیتے ہوئے انہیں لکھنے اور شائع کرنے میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔"

تعریف متعیّن کرنے میں عجز کا اظہار

یہ تعریف اپنی جگہ ایک بہت بڑی حقیقت پر مبنی ہونے کے باوجود خود اس امر کا اعتراف ہے کہ خبر کی کوئی ہمہ گیر تعریف ممکن نہیں ہے مذکورہ بالا تعریف کی رُو سے ایک ماہر اخبار نویس کی تربیت یافتہ حس جس واقعہ کے متعلق یہ فیصلہ کر دے کہ یہ اپنے اندر اخباریت رکھتا ہے اور اسے پبلک تک ضرور پہنچانا چاہیئے خبر کہلاتا ہے۔ پس خبر کا معیار ماہر اخبار نویس کا تربیت یافتہ ذہن ٹھہرا نہ کہ کوئی مقررہ اصول یا ضابطہ۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر کی تعریف نہیں کہلا سکتی۔ ہاں اسکو تعریف متعیّن کرنے میں عجز کا اظہار ضرور کہہ سکتے ہیں۔ بایں ہمہ خبر کی یہ تعریف صداقت پر مبنی ہے۔ ہر چند کہ ماہرین کے نزدیک بھی خبر کی تعریف کرنا مشکل ہے تاہم ایک ماہر اخبار نویس کے لئے روزمرہ کے واقعات میں سے خبریں الگ کر لینا کوئی مشکل امر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے تربیت یافتہ ذہن کی مدد سے اپنے قارئین کے مزاج، فکری نہج اور جذبات و احساسات اور ان کے مخصوص قومی اور جماعتی حالات کے پیش نظر ایک ہی نظر میں ایسے واقعات کو بھانپ لیتا ہے کہ

جن میں اخباریت کا عنصر موجود ہوتا ہے اور وہ مخصوص الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر انہیں اپنے اخبار کی زینت بناتا اور اس میں ایک خاص اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے ماہرین نے اخبارنویس کو A practical Psychologist یعنی عملاً "سماجی نفسیات کا ماہر قرار دیا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مجموعی لحاظ سے اپنے قارئین کی نفسیات کو خوب سمجھتا ہو اور یہ فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو کہ کونسا واقعہ اس کے اپنے قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔

عوامی دلچسپی کا پہلو

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ جب عوامی دلچسپی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے تو اخبارنویس کے تربیت یافتہ ذہن کی بجائے کیوں نہ عوامی دلچسپی کو خبروں کا معیار قرار دیا جائے اور کیوں نہ خبر کی یہ تعریف کی جائے کہ ہر وہ واقعہ یا امر جس میں عوامی دلچسپی کا پہلو موجود ہو خبر کہلاتا ہے۔ اس میں شک نہیں خبروں کے معاملے میں عوامی دلچسپی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن اسے کلیۃً خبروں کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ بعض معاملات اور بعض واقعات بظاہر بہت معمولی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ عام آدمیوں کو ان میں دلچسپی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ لیکن ایک اخبارنویس اپنے تربیت یافتہ ذہن کی مدد سے ان معمولی واقعات میں بھی دلچسپی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتا ہے اور انہیں اس رنگ میں عوام کے سامنے پیش کرتا ہے کہ عوام ان میں دلچسپی لئے بغیر نہیں رہتے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو ان واقعات سے براہِ راست متعلق ہوتے ہیں جب انہیں اخبار میں پڑھتے ہیں تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور وہ بھی ان سے دوسروں کی طرح ہی محظوظ ہوتے ہیں۔ اب اگر عوامی دلچسپی کو خبروں کا معیار قرار دے لیا جائے اور اخبارنویس کے تربیت یافتہ ذہن کو چنداں اہمیت نہ دی جائے تو قطع نظر اس سے کہ عوامی دلچسپی کا معیار جلد جلد بدلتا رہتا ہے بہت سے ایسے واقعات جو بظاہر معمولی اور غیر اہم ہونے کے باوجود آجکل اخباروں میں جگہ پاتے ہیں اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں کبھی خبروں کے ذیل میں شمار نہیں ہو سکتے۔ اس طرح خبروں کے دائرہ کا محدود ہونا لازمی ہو جائے گا۔

بعض واضح اور روشن مثالیں

مثال کے طور پر میں بعض ایسے واقعات کو لیتا ہوں کہ جو دیکھنے میں انتہائی معمولی تھے اور ہرگز اس قابل نہ تھے کہ چند ایک لوگوں کے سوا عوام ان میں دلچسپی لیتے لیکن ایک ماہر اخبارنویس نے اپنے تربیت یافتہ ذہن کی مدد سے ان میں دلچسپی کے دبے ہوئے عنصر کو اُبھار کر انہیں اعلیٰ درجہ کی خبروں میں تبدیل کر دیا اور جب وہ خبریں اخباروں میں چھپیں تو نہایت دلچسپی سے پڑھی گئیں اور قہوہ خانوں میں گفتگو کا موضوع بنی رہیں۔

پہلی مثال

ایک مرتبہ لندن میں ایسا ہوا کہ بلی کا ایک بچہ پھرتا پھراتا ایک ٹرام کار کے پچھلے حصے کے ایک پائپ میں جا گھسا۔ اسی حالت میں ٹرام کار چل پڑی۔ بلی کے بچے نے ٹرام کے چلنے پر وہیں بیٹھے بیٹھے میاؤں میاؤں شروع کر دی۔ اس کی میاؤں میاؤں سے ڈرائیور بہت پریشان ہوا کہ آج انجن میں سے یہ کیا آواز آ رہی ہے۔ اگلے سٹیشن پر اس نے انجن کا معائنہ کیا وہ بالکل درست حالت میں تھا۔ جونہی ٹرام کار آگے روانہ ہوئی تو پھر میاؤں میاؤں کی آواز آنی شروع ہو گئی۔ اس پر کچھ مسافر بھی چونکنے ہوئے لیکن پھر باتوں میں مصروف ہو گئے اور کوئی توجہ

نزدیکی اگلے اسٹیشن پر ڈرائیور نے ایک دفعہ پھر انجن کا بغور معائنہ کیا۔ اس دوران میں بلی کا بچہ پھر بول پڑا۔ تب جا کر ڈرائیور کو پتہ لگا کہ کیا معاملہ ہے اور اس نے اُس پائپ میں سے بلی کے بچے کو نکالا اور اطمینان سے آگے روانہ ہوا۔ اتفاق سے ایک اخبار نویس بھی ٹرام کار میں سوار تھا اور وہ ڈرائیور کی پریشانی کو محسوس کر رہا تھا۔ مسافر تو اس واقعہ پر ہنس کر خاموش ہو رہے لیکن اخبار نویس کے ذہن نے اس واقعہ سے ہی ایک دلچسپ خبر کا خاکہ تیار کر لیا۔ شام کو جب وہ اخبار کے دفتر میں پہنچا تو اس نے جاتے ہی ایک نہایت پُر لطف خبر بنائی اور اس پر سُرخی یہ جمائی:۔

میاؤں میاؤں کی غیبی آواز

ٹرام کار کا ڈرائیور اچنبھے میں پڑ گیا

دوسرے دن جب یہ خبر اخباروں میں چھپی تو لوگوں نے اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا اور انہوں نے اسے زندگی کا ایک لطیف حادثہ قرار دیا۔

دوسری مثال

اسی طرح سینٹ جارج چیپل یعنی گرجا میں ایک دن پادری وعظ کہہ رہا تھا اور سامعین ہمہ تن گوش بنے اس کی روحانی باتیں سن رہے تھے۔ اگلی قطار کے ایک ڈیسک پر ایک بچہ بیٹھا ڈیسک کے اگلے حصہ سے جو پیتل کے دو قبضوں کے ساتھ ڈیسک میں جڑا ہوا تھا اور اوپر نیچے حرکت کر سکتا تھا کھیل رہا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ کی ایک انگلی قبضہ میں پھنس گئی اور اس طرح پھنسی کہ اس قبضہ کی گرفت سے انگلی کا نکلنا مشکل ہو گیا۔ بچہ درد کی وجہ سے رونے لگا۔ اس کی آواز سے وعظ میں قدرے خلل واقع ہوا۔ ایک آدمی نے جلدی سے جیب سے پیچ کس نکالا اور قبضہ کے پیچ کھول کر اسے ڈیسک سے علیحدہ کر لیا اور فوراً بچے کو باہر لے گیا اور وہاں جا کر قبضہ کی گرفت سے اس کی انگلی چھڑا لی۔ یہ سب کچھ چند منٹ میں ہو گیا۔ پادری کا وعظ جاری رہا لوگ اسی طرح محو سماعت رہے اور لوگوں کے چہروں پر بچے کی چیخ و پکار پر ناک بھوں چڑھنے کے سوا کوئی تاثر ظاہر نہ ہوا۔ دوسرے دن صبح ایک اخبار کے صفحہ اوّل پر لوگ یہ سرخیاں دیکھ کر یکدم متعجب ہو گئے:۔

سینٹ جارج چیپل میں حادثہ

وعظ کے دوران ایک نوعمر بچہ شکنجے میں

اخبار نے اس واقعہ کو ایسے دلچسپ انداز میں لکھا کہ لوگ اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہے۔ پھر اس میں یہ طنز بھی تھا کہ چھوٹے بچوں کو آگے بٹھانا کتنا معیوب ہے۔

تیسری مثال

اسی طرح امریکہ کے اخبار "بالٹی مور ایوننگ سن" کا رپورٹر ہنری ہائیڈ ایک دن صبح گھر سے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ گزشتہ چند روز کی شدید سردی کے بعد اُس دن موسم غیر معمولی طور پر خوشگوار تھا۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی اور لوگ خوب ہنسی خوشی اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ ہنری ہائیڈ اس سوچ میں غرق کہ آج کہاں سے کوئی خبر حاصل کرے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس نے نگاہ اٹھائی اور سڑک پر چلنے والوں کو غور سے دیکھا اور پھر خود اپنے لباس پر نگاہ ڈالی اور ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ دفتر پہنچنے تک اس کے ذہن میں ایک نہایت دلچسپ خبر تیار ہو چکی تھی۔ راستے میں ہزاروں آدمی آ جا رہے تھے اور انہوں نے بھی وہی کچھ دیکھا جو ہنری ہائیڈ کو نظر آیا لیکن ہنری ہائیڈ اس نظارے میں سے دلچسپی کا وہ عنصر اخذ کر چکا تھا جو دوسرے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا۔ اس نے دفتر جا کر جو خبر لکھی وہ اس موسم کی بہترین خبر قرار پائی اور لوگوں نے اسے اس قدر دلچسپی

کے ساتھ پڑھا کہ کئی دن تک اس کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اس کی خبر کی سُرخیاں کچھ اِس مفہوم کی حامل تھیں :-

"جاڑے کی رحلت کے بعد موسم بہار کا نیم

لوگوں کے لباس نے شہر کی ہیئت بدل ڈالی"

چوتھی مثال

اِسی طرح یورپ کے ایک شہر کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کی بیوی ہسپتال میں داخل تھی وہ اُس سے ملنے کے لئے ہسپتال گیا جس وارڈ میں اُسے جانا تھا وہ تیسری منزل پر واقع تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے لفٹ کے ذریعہ اُوپر چلا جائے۔ لیکن اتفاق سے لفٹ چلانے والا اپنی ڈیوٹی پر موجود نہ تھا۔ اُس نے انتظار کیا لیکن لفٹ والا پھر بھی نہ آیا۔ آخر اس نے خود لفٹ کو چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ جونہی وہ لفٹ میں داخل ہوا ایک نرس دوڑتی ہوئی آئی اور یہ کہتے ہوئے لفٹ میں آگھسی کہ مجھے تیسری منزل پر جانا ہے۔ آدمی نے بٹن دبایا لفٹ اُوپر اُٹھنی شروع ہوئی لیکن لفٹ ابھی درمیان میں ہی تھی کہ بجلی یکدم فیل ہوگئی۔ قریباً ایک منٹ کے بعد ہی بجلی کی رَو عود کر آئی اور وہ دونوں اُوپر پہنچ گئے۔ لفٹ سے باہر نکلتے ہوئے نرس نے کہا خدا کا شکر ہے کہ بجلی کی رَو جلد واپس آگئی مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں مجھ پر کیس قائم نہ ہو جائے۔ آدمی یہ سُنکر ہنسا اور کہنے لگا میری بیوی بھی بڑی وہمن ہے اگر اور پندرہ بیس منٹ تک بجلی نہ آتی اور یہ خبر اُس تک پہنچ جاتی تو وہ تو مجھ سے قطع تعلق کر لیتی۔ بات آئی گئی ہوئی اور دونوں اپنے اپنے کام پر چل دیئے۔ یہ واقعہ جب ایک اخبار نویس نے سُنا تو اس نے اس کی تصدیق کرنے کے بعد نہایت پُرلطف خبر بنائی اور لوگ اس خبر کو پڑھ کر دوہرے ہو ہو گئے۔ خبر کا عنوان تھا۔

"بجلی فیل ہونے سے

نکاح ٹوٹنے اور نوکری چھوٹنے کا خطرہ"

اِس خبر کے ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اصل واقعہ اپنی ذات میں بہت معمولی ہے لیکن اس کے عنوان میں حیرت و استعجاب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ بایں ہمہ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ واقعہ اس عنوان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جو چیز واقعہ میں بظاہر مفقود تھی۔ اخبار نویس نے اُسے عنوان میں سمو کر واقعہ کو ازحد دلچسپ بنا دیا۔

پانچویں مثال

اور یہ خبر تو آپ سب نے بھی کچھ ماہ قبل نوائے وقت میں پڑھی ہوگی کہ مقبوضہ کشمیر کی بخشی حکومت نے حکومت ہند سے درخواست کی تھی کہ انبالہ چھاؤنی میں جو کشمیری مزدور کام کرتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لئے وہاں گوشت کی ایک دکان کھولنے کی اجازت دیدی جائے۔ حکومت ہند نے غالباً ہندوؤں کی مخالفت کے ڈر سے دکان کھولنے کی اجازت نہ دی اور معذرت کر دی۔ خبر اتنی ہی تھی کہ کشمیری مزدوروں کو انبالہ چھاؤنی میں گوشت کی دکان کھولنے کی اجازت نہیں مل سکی۔ اس میں بیشک خبریت موجود تھی۔ لیکن اخبار نے اس پر اپنی طرف سے ایک نہایت دلچسپ سرخی لگا کر اس کی اہمیت اور اس کی دلچسپی میں بقدر اضافہ کر دیا کہ شاید ہی کوئی شخص اس کو پڑھے بغیر رہا ہو۔ خبر کا عنوان تھا۔

"قدرِ ایاز"

اس دو لفظی عنوان میں جو طنز کیا گیا ہے اُس سے مسئلہ کشمیر کا تمام پس منظر ہندوستان کا بالجبر قبضہ مسلم قوم سے بخشی غلام محمد کی غداری اور اس کے صلہ میں نہرو حکومت

کی سرد مہری سب کچھ ذہن میں آجاتا ہے۔ حالانکہ خبر کے متن میں ان میں سے کسی ایک بات کا بھی ذکر نہ تھا۔ اگر سرخی صرف یہ ہوتی کہ "گوشت کی دکان کھولنے کی اجازت نہیں ملی" تو بہت سے قارئین اسے ایک جگہ کا مقامی معاملہ سمجھ کر نظر انداز کر جاتے اور اس کو چنداں اہمیت نہ دیتے لیکن ایک ماہر اخبار نویس کے تربیت یافتہ ذہن کی اپج نے دو لفظوں میں دوسروں کو وہ کچھ ذہن نشین کرا دیا جو شاید ایک غیر ماہر کی قلم سے نکلا ہوا طویل مضمون بھی ذہن نشین نہ کرا سکتا۔

یقیناً اس خبر کو اور اس کے عنوان کو پڑھنے کے بعد بہت سے قارئین گہری سوچ میں پڑ گئے ہوں گے اور کشمیر کے معاملے میں ہندوستانی حکومت کی تمام زیادتیاں اور ہٹ دھرمیاں ایک ایک کر کے ان کی نگاہ کے سامنے آگئی ہوں گی اور کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی بے لسبی اور بے کسی کا درد انگیز نقشہ کھنچ گیا ہوگا۔ میرے خیال میں اس خبر کو اخبار نے جس انداز سے شائع کیا اسے فنِ صحافت کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

چھٹی مثال

دور جانے کی ضرورت نہیں ۲۸ فروری ۱۹۵۷ء کے ہی نوائے وقت میں ایک عنوان آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ ایک چھوٹی سی خبر کا چھوٹا سا عنوان یہ تھا:-

"کچہری میں بندوق چل گئی"

اطمینان رکھئے۔ کچہری کی حدود میں کوئی دنگا فساد نہیں ہوا کسی نے کسی کی جان نہیں لی۔ آدمی تو آدمی کوئی چڑیا کا بچہ بھی نہیں مرا۔ قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک شخص بندوق لیکر لائسنس کی تجدید کے لئے کچہری گیا۔ وہ ایک عرضی نویس سے درخواست تحریر کرا رہا تھا عرضی نویس کا بھائی بندوق ہاتھ میں لیکر اُسے دیکھنے لگا۔ اس معائنے کے دوران ہی گھوڑے پر ہاتھ جا لگا۔ لیجئے فائر ہو گیا۔ دھواں ختم ہوا تو پتہ چلا کہ "خیر میر" ہے۔ سب لوگ جی جان سے سلامت ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ عرضی نویس کے بھائی جان حراست میں لے لئے گئے اور اُن کے خلاف ایک عدد رپورٹ درج رجسٹر ہو گئی۔ ایک عام آدمی کی نگاہ میں یہ واقعہ خبر اُس وقت کہلاتا جب بندوق کی گولی کسی کے سینے میں اُتر جاتی یا اور کچھ نہیں تو ایک آدھ کی ٹانگ ہی زخمی ہو جاتی۔ لیکن دیکھئے ایک اخبار نویس نے اس معمولی سے واقعہ کو ایک چمکدار اور شوخ عنوان سے دلچسپ اور جاذب توجہ بنا دیا۔ اس عنوان میں "کچہری" کا لفظ عنوان ہی نہیں بلکہ خبر کی جان ہے۔

واقعات کی اخباری حیثیت اور اس کا تعین

اِن مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ خبروں کے اعتبار سے عوامی دلچسپی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن واقعات کو خبر کی حیثیت سے پرکھنے میں کلی طور پر عوامی دلچسپی پر بھی حصر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بعض ایسے غیر اہم اور معمولی واقعات جو اِس تعریف کی رُو سے خبر کے ذیل میں نہیں آتے اخبارات میں جگہ پا سکتے ہیں اور ایک ماہر اخبار نویس مصنوعی طور پر یا تو اُن میں عوامی دلچسپی کا پہلو داخل کر دیتا ہے۔ یا اگر وہ پہلو دبا ہوا ہو تو اُس کو اِس رنگ میں پیش کر سکتا ہے کہ جس سے وہ پہلو اُبھر کر عوام کو اُس غیر اہم بات کی طرف بھی متوجہ کر سکے اور پھر انہیں یہ احساس بھی نہ ہونے دے کہ انہیں خواہ مخواہ ایک غیر اہم بات پڑھنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

پس خبر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جن واقعات یا امور پر مشتمل ہو وہ ضرور ہی غیر معمولی نوعیت کے ہوں یا فی ذاتہ حیرت و استعجاب

کو اُبھارنے والے ہوں یا عوامی دلچسپی کا عنصر ان میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہو۔ یہ سب باتیں جن واقعات میں فی ذاتہٖ موجود ہوں گی وہ ضرور خبر کہلائیں گے لیکن جن میں یہ باتیں موجود نہ بھی ہوں خاص حالات اور خاص اوقات میں یا خاص اثرات کے ماتحت وہ بھی خبر کہلا سکتے ہیں۔ ان خاص حالات یا خاص اوقات یا خاص اثرات کی نبض پر ہاتھ رکھنا اخبار نویس کا کام ہے۔ وہ خبر کی لفظی تعریف سے بے نیاز ہوتے ہوئے نبض پہچاننے کی صلاحیت کو کام میں لاتا ہے اور اس کی مدد سے بآسانی پتہ لگا لیتا ہے کہ کوئی واقعہ ان حالات اور ان اوقات میں یا ان ان اثرات کے ماتحت خبر کہلا سکتا ہے یا نہیں۔ اسی لئے ماہرین کا کہنا ہے کہ خبر کا جامہ پہننے سے قبل کسی واقعہ کی اخباری حیثیت کا اندازہ محض خبر کی لفظی تعریفوں کی روشنی میں نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ صلاحیت صرف اور صرف تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا تعلق ہر اخبار نویس کی ذاتی مشق، دلی لگاؤ اور شغف سے ہوتا ہے۔ چنانچہ فنِ صحافت کے مشہور برطانوی ماہر مسٹر ایف۔ جے۔ مینز فیلڈ لکھتے ہیں:۔

"خبر کی یہ تعریفیں (جو ماہرین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق کی ہیں) اس سوال کا کہ خبر کس کو کہتے ہیں حقیقی جواب نہیں ہیں یہ تو ایک طرح سے عجز کا اظہار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تان بالآخر فہم و ادراک اور تجزیہ پر آکر ٹوٹتی ہے۔ اصل جواب مشق اور تجربہ کے میدان میں دریافت کیا جاتا ہے۔ جو اخبارات عملاً اس کا حقیقی جواب دریافت کر لیتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اور جو دریافت نہیں کر پاتے انہیں چار و ناچار ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اخبارات کی جتنی قسمیں ہیں اس سوال کے اتنے ہی مختلف النوع جواب ہوں گے۔"

(The Complete Journalist) - P. 43

بہر حال یہ واضح ہے کہ خبروں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ زندگی کا ہر واقعہ خواہ وہ بظاہر کتنا ہی معمولی اور غیر اہم کیوں نہ ہو بعض اثرات یا عوامل کے تحت خبر کے ذیل میں آ سکتا ہے اور خبروں کے دائرے کی اسی وسعت کے پیش نظر خبر کی کوئی حتمی اور اٹل تعریف متعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ ماہرین کی وضع کردہ تعریفیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ انہیں ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناکافی اور نامکمل ہیں۔

مُنہ بولتی خبریں

ہم نے ابھی خبروں کی جن تعریفوں پر غور کیا ہے ان میں واقعات کی غیر معمولی نوعیت حیرت و استعجاب اور عوامی دلچسپی کے عناصر پر زور دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ تمام عناصر خبروں کی جان ہیں۔ جن واقعات میں یہ عناصر یا ان میں سے کوئی ایک موجود ہو گا۔ وہ یقیناً خبروں کے ذیل میں آئیں گے چنانچہ بعض ایسے غیر معمولی واقعات ہوتے ہیں جن میں یہ عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر انہیں بہترین خبریں قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں غیر معمولی نوعیت، حیرت و استعجاب اور عوامی دلچسپی کے عناصر اس قدر نمایاں ہوتے ہیں کہ اخبار نویس ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی ان کے متعلق یہ فتویٰ صادر کر سکتے ہیں کہ یہ واقعات مُنہ بولتی خبریں ہیں۔ مثلاً جنگوں کا چھڑنا، حکومتوں کا

مخالفین کے سامنے پیش کرنا چاہتا
ہوں وہ اس مضمون کا آخری حصہ ہے۔
جس کو میں نے صاحبزادہ کے اپنے الفاظ
میں نقل کیا ہے۔ اس وقت صاحبزادہ کی
عمر اٹھارہ انیس سال کی ہے۔ اور تمام
دنیا جانتی ہے کہ اس عمر میں بچوں کا شوق
اور امنگیں کیا ہوتی ہیں۔ زیادہ سے
زیادہ اگر وہ کالجوں میں پڑھتے ہیں تو اعلیٰ
تعلیم کا شوق اور آزادی کا خیال اُن
کے دلوں میں ہو گا۔ مگر دین کی یہ ہمدردی
اور اسلام کی حمایت کا یہ جوش جو
اُوپر کے بے تکلف الفاظ سے ظاہر
ہو رہا ہے ایک خارق عادت ہے۔
...... اب وہ سیاہ دل لوگ
جو حضرت مرزا صاحب کو مفتری کہتے
ہیں اس بات کا جواب دیں کہ اگر یہ
افتراء ہے تو یہ سچا جوش اس
بچہ کے دل میں کہاں سے آیا؟ جھوٹ
تو ایک گند ہے۔ پس اس کا اثر تو
چاہیئے تھا کہ گندہ ہوتا نہ کہ ایسا پاک
اور نورانی جس کی کوئی نظیر ہی نہیں
ملتی۔ اگر ایک انسان افتراء کرتا
ہے تو اگرچہ وہ باہر کے لوگوں سے
افتراء کو چھپا بھی لے مگر اپنے ہی
بچوں سے جو ہر وقت اس کے ساتھ
رہتے ہیں چھپا نہیں سکتا۔ وہ اس کی
ہر ایک حرکت اور سکون کو دیکھتے ہیں،
ہر ایک گفتگو کو سُنتے ہیں۔ ہر موقع پر
اس کے خیالات کو ظاہر ہوتے دیکھتے
ہیں۔ پس اگر افتراء ہو تو ضرور یہ
ہے کہ وہ افتراء کسی نہ کسی وقت اس
کے اپنے بچوں اور بیوی پر ظاہر ہو
جائے۔ اے بدقسمت لوگو! غور کرو
کہ یہ مفتری کی اولاد جو اس کے افتراء
کے زمانے میں پیدا ہوا اور افتراء
کے زمانے میں پرورش پائے ایسی
ہوا کرتی ہے؟ کیا تمہارے دل
انسانی دل نہیں جو ان باتوں کو
سمجھ نہیں سکتے اور ان خیالات
کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔
کیوں تمہاری سمجھیں اُلٹی ہو گئی
ہیں۔ غور کرو کہ جس کی تعلیم و
تربیت کا یہ (حضرت محمود۔ ناقل)
پھل ہے وہ کاذب ہو سکتا ہے؟
اگر وہ کاذب ہے تو پھر دنیا
میں صادق کا کیا نشان ہے!"

(رسالہ ریویو آف ریلیجنز اُردو
بابت ماہ مارچ ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۱۷ تا ۱۱۹)

ڈاکٹر غلام محمد صاحب آج اپنے امیر مرحوم کی شہادت
پر غور کریں اور بتائیں کہ کیا اُن کے دل انسانی
دل نہیں جو ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتے؟ اور سوچیں
کہ اگر حضرت محمود ایدہ اللہ بنصرہ العزیز ایسے
پاک اور بے نظیر روحانی وجود کو وہ گندہ اور ناپاک